نومبر ۲۰۰۴ء / شوال ۱۴۲۵ھ

ماہنامہ

شعاع عمل لکھنؤ

قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَ تَعَالٰی

قَدْ جَاءَکُمْ مِنَ اللّٰہِ نُوْرٌ وَ کِتَابٌ مُبِیْنٌ

بیشک اللہ کی طرف سے تمہارے پاس نور آیا ہے اور روشن کتاب

موسسۂ نور ہدایت حسینیہ غفران مآب لکھنؤ-۳

R.N.I.No. UPBIL/2004/13526 - November-2004

Monthly

SHUA-E-AMAL

Lucknow

शुआ-ए-अमल

हिन्दी, उर्दू मासिक पत्रिका

लखनऊ

NOOR-E-HIDAYAT FOUNDATION
Imambara Ghufran Maab, Chowk
LUCKNOW-3 (U.P.) INDIA
Phone : 2252230

فہرست مضامین

نومبر ۲۰۰۴ء

سخنان

شہر لکھنؤ

سرکار صفوۃ العلماء آقائے شریعت مولانا سید کلب عابد نقوی صاحب رحمت مآب آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے اجلاس چہل و چہارم منعقدہ ۱۱/اپریل ۱۹۶۴ء بمقام حسینیۂ حضرت غفرانمآبؒ کے خطبۂ صدارت استقبالیہ میں فرماتے ہیں:

(ہمارے لکھنؤ میں) ''کوئی مشہور جگہ نہیں ہے، کوئی قابل دید قصر سلطانی نہیں ہے، کوئی اعجوبۂ روزگار مقبرہ نہیں۔ یہاں اشتیاق دید میں سیاحوں کو جو عمارتیں کھینچ لاتی ہیں وہ امامباڑے ہیں، مساجد ہیں اور کربلائیں ہیں۔ غور کرنے کی بات ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد سے ہزار ہا مسلم والیان مملکت، تاجدار سلاطین وصوبہ دار حضرات گذرے۔ جن میں سے بہت سے شیعہ مذہب کے نام لیوا بھی تھے پھر بھی آخر اتنے مذہبی آثار لکھنؤ ہی میں کیوں ملتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ دوسری راجدھانیوں کو شاہان وسلاطین تو ملے لیکن شاہان دنیا کو دین کی راہ پر لگانے والے خاندان اجتہاد کے سے علماء نہ ملے۔ اگر صرف بادشاہوں کے جعفری ہونے سے کوئی مقام، مرکز مذہب بن سکتا تھا تو کیا بجائے لکھنؤ کے گولکنڈہ اور مرشدآباد نہ ہوتے جہاں برسوں ہماری شاہی رہ چکی ہے۔ شاید اس حقیقت کے اعتراف میں کسی منصف مزاج کو عذر نہ ہو کہ علماء کرام خاندان اجتہاد کی رہنمائی اور شاہان اودھ کے مطلق العنان فرمانروا ہونے کے باوجود علماء کی اطاعت نے جوان کو آخرت میں فوائد پہنچا رہے ہوں گے ان سے قطع نظر نہ صرف ہندوستان بلکہ مشاہد مشرفہ میں بھی اس وقت ان کا فیض اور نام جاری ہے۔ ہندوستان کی عظیم ترین بادشاہتوں کی کوئی یادگار مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ یا کسی دوسری جگہ نہیں ملتی مگر آج کے چند ضلعوں کے برابر حصۂ ملک پر حکومت کرنے والے مختصر سی شاہی کے مالک شاہان اودھ کی نشانی ''نہر آصفی'' اور ''خیریہ اودھ'' اب بھی پیاسوں کے لیئے سیرابی اور بھوکوں کے لیئے شکم سیری کا سبب بنی ہوئی ہے۔ بہرصورت دین ودنیا کے اس اجتماع نے زبان و ادب، اخلاق وتہذیب کے ساتھ ساتھ لکھنؤ کو علمی اور مذہبی مرکزیت بھی دیدی۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہاں سے جو تحریک اٹھتی ہے وہ بالعموم ہندوستان گیر ہوجاتی ہے۔ یہاں کی اچھی بری ہر لہر دماغوں سے ٹکراتی ہے اور عام ذہنوں پر اثرانداز ہوکر عمل کو متاثر کرتی ہے۔ جس کا تازہ ثبوت یہ ہے کہ جب لکھنؤ نگر مہاپالیکا نے لکھنؤ کی مشہور ومعروف درسگاہ سلطان المدارس کے خلاف اقدام کیا اور سابق طلباء مدرسہ کی انجمن نے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تو حیدرآباد سے لے کر کشمیر تک کوئی ایسی شیعہ بستی نہ تھی جو ہم آواز نظر نہ آتی ہو اور جہاں سے احتجاجی ریزولیشن تار اور خطوط کی بوچھار نہ ہوگئی ہو اور یہ تقریباً متفقہ احتجاجی آوازیں صدا بہ صحرا بھی ثابت نہ ہوئیں بلکہ انشاءاللہ عنقریب اس کے نتائج منظر شہود پر آجائیں گے۔

مگر اسی مرکزیت کا ایک منفی نتیجہ یہ بھی ہے کہ یہاں جو غلط اور نامناسب بات بھی ظہور پذیر ہوتی ہے اس کے اثرات بھی ہندوستان گیر ہوجاتے ہیں۔ یہاں کا قومی اختلاف صرف یہیں تک محدود نہیں رہتا بلکہ تقریباً ہندوستان کی ہر شیعہ بستی میں افتراق کی لہر دوڑا دیتا ہے اور ہر بستی دو

گروہوں میں تقسیم ہوجاتی ہے۔ یہاں کی بے جا اور غلط رواسم کی بھی دوسری جگہوں میں پیروی کی جاتی ہے۔ ہماری انتہائی بدقسمتی ہے کہ اس وقت ہمارا یہی دینی مرکز تمام ان امراض میں شدت سے گرفتار ہے جو کسی قوم کو پستی میں لے جانے اور بالآخر فنا کا سبب بن سکتے ہیں۔ اقتصادی اور معاشی بدحالی یہاں حد سے زیادہ ہے اور اس کے نتائج یعنی اخلاقی پستی، تعلیم کی کمی اور بے راہ روی خصوصاً نئی نسل میں روز بروز نمایاں ہوتی جاتی ہیں۔ اس وقت جب کہ دوسری قوموں کے کمسن اور نوجوان مدارس و اجلاس میں اساتذہ و علماء کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیے دماغوں کو نور علم سے منور کرنے میں مصروف ہوتے ہیں ہمارے بچے اور نوجوان گلیوں میں آوارہ گردی اور تضیع اوقات میں مشغول نظر آتے ہیں۔ یہ اسی شہر کا ذکر ہے جہاں کچھ ہی عرصہ قبل ماحول کے اثر سے غیر تعلیم یافتہ افراد کی بھی شستہ گفتگو، رکھ رکھاؤ اور نشست و برخاست کے انداز جہالت کے پردہ پوش ہوجاتے تھے۔ جس شہر کی طرف منسوب ہونا ہی نکھرے ستھرے اخلاق، ذہانت اور قابلیت کا مرادف سمجھا جاتا تھا شاید مکاری اور جہالت ہی کا یہ اثر بھی ہو کہ اس وقت لکھنؤ ہی اختلافات کی آماجگاہ اور پارٹی بندیوں کا مرکز ہے۔ دوسروں پر اتہام لگانا، تہمت تراشیاں، بڑھتے ہوؤں کو گرانا اور گرے ہوئے کو کچل دینا بڑے سے بڑا قابل فخر کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔

چونکہ لکھنؤ کو ایسی مرکزیت حاصل ہے جس کے ہر انداز کی دیگر شیعہ بستیاں نقل کرتی ہیں، ہر تحریک سے دوسرے افراد قوم متاثر ہوتے ہیں لہٰذا مذکورہ بالا برائیاں بھی اثر انداز ہو رہی ہیں۔ اور روز بروز زیادہ با اثر ہوتی جائیں گی۔ لکھنؤ کو ہندوستانی دنیائے شیعیت میں قلب کی حیثیت حاصل ہے۔ جناب امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں ''جسم انسانی میں ایک چھوٹا سا گوشت کا ٹکڑا ہے اگر وہ ٹھیک ہوگیا تو سب کچھ ٹھیک ہے اور اگر وہ خراب ہوا تو پھر سب کچھ خراب ہوا اور وہ دل ہے۔''

جس طرح قلب انسانی ہے اسی طرح جو شہر مرکز قومی ہو بہت کچھ اس کی اصلاح و فساد پر قوم کی صلاح و فساد موقوف ہے۔ اب ایک علاج تو یہ ہوسکتا ہے کہ لکھنؤ سے مرکزیت چھین لی جائے تو کیا ہندوستان کے کسی دوسرے شہر میں مرکز بننے کی صلاحیت ہے اور پھر مرکزیت دو ایک دن میں نہیں ملتی اس کے لیئے صدیاں درکار ہیں۔ اور بغیر مرکز کے قوم کی وہی حالت ہوگی جیسے کتاب کا شیرازہ توڑ کر اسکو منتشر کر دیا جائے۔ اسی بناء پر ہر مذہبی اور دینی درد رکھنے والے اور ہر اصلاح قوم کے خواہشمند کا پہلا فرض یہ ہونا چاہیئے کہ تعمیری کوششوں کی ابتدا لکھنؤ سے کرے۔ سب سے پہلے یہاں کی اصلاح اور درستی کی فکر کرے۔''

قرآن شناسی

تلاوت قرآن کے شرائط

آیت اللہ شیخ جوادی آملی مدظلہ العالی

ترجمہ: مولانا سید احتشام عباس زیدی صاحب

قرآن کریم نے پیغمبر اکرمؐ کا تعارف یوں کرایا ہے:

یتلوا علیھم آیاتہ و یزکیھم و یعلمھم الکتاب والحکمۃ (جمعہ ۲) وہ ان لوگوں پر قرآنی آیتوں کی تلاوت فرماتے ہیں، ان کے نفسوں کو پاکیزہ بناتے ہیں اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔

یہ تین مرحلے (تلاوت، تزکیہ اور تعلیم) شان رسالت کا جزء ہیں اور فریضۂ رسالت کی ادائیگی کے حکم سے پہلے یہ تینوں امر خود حضرتؐ کے سلسلہ میں بروئے عمل لائے گئے۔ ان پر قرآنی آیات کی تلاوت کی گئی، خداوند عالم نے آپؐ کو کتاب وحکمت کا عالم بنایا اور آپ کو مطہر وتزکیہ شدہ قرار دیا۔ اس کے بعد قرآن نے فرمایا: یہی امور جو خداوند عالم نے آپ پر جاری فرمائے ہیں، اب آپؐ لوگوں سے متعلق عمل میں لائیں۔ فرق یہ ہے کہ عوام نہ آپ کی مانند فیضیابی کی قدرت وطاقت رکھتے ہیں اور نہ براہ راست فرشتوں یا ان سے بالاتر سے رابطہ پیدا کرسکتے ہیں۔

بنا براین خداوند عالم نے پیغمبر اکرمؐ سے متعلق تلاوت قرآن، تزکیہ اور تعلیم کو اپنے ذمہ لیا۔ اس کے بعد ان کا ان صفات کے ساتھ تعارف کرایا اور انہیں حکم دیا کہ لوگوں کے لیئے آیات الٰہی کی تلاوت کرو جیسے میں نے تم پر آیات کی تلاوت کی ہے۔ لوگوں کو یوں ہی علم وحکمت کی تعلیم دو، جیسے میں نے تم کو تعلیم دی ہے۔ لوگوں کو اسی طرح پاکیزہ بناؤ اور ان کے نفوس کو پاک کرو جیسے میں نے تمہیں مطہر اور تزکیہ شدہ بنایا ہے۔ البتہ فرق یہ ہے کہ رسولؐ خدا ان تینوں امور و مراحل میں ان مقامات پر فائز تھے جو صرف آنحضرتؐ سے مخصوص تھے اور دوسرے نہ ان درجات تک پہنچے ہیں نہ پہنچیں گے۔

تلاوت قرآن

تلاوت کے سلسلہ میں قرآن نے انسانوں کو حکم دیا کہ جہاں تک تم سے ممکن ہو اور تمہیں میسر ہو، قرآن کی تلاوت کرو:

فاقرؤا ماتیسر من القرآن (مزمل ۲۰)

اس وحی الٰہی کی تلاوت پیغمبر اکرمؐ پر کس طرح ہوئی؟

قرآن میں ارشاد ہوتا ہے: ہم نے برحق تم پر قرآن کی تلاوت کی: **تلک آیات اللہ نتلوھا علیک بالحق** (آل عمران ۱۰۸) کہ یہاں تلاوت حق کے ہمراہ ہے یعنی صرف حق وحقیقت ہی ہے اور کوئی باطل اس کے حریم میں راہ نہیں پاسکتا۔

تلاوت کس طرح حق ہوتی ہے؟

تلاوت اس صورت میں حق ہوتی ہے:

۱۔ تلاوت شدہ امر حق ہو

۲۔ تلاوت کرنے والا صحیح تلاوت کرے

۳۔ تلاوت سننے والا درست سمجھے اور درست قرار دے

اگر ان تینوں ارکان میں سے کوئی ایک برحق نہ ہو تو یہ

تلاوت حق نہیں ہے۔ یعنی اگر مطلب حق نہ ہو یا کہنے اور پڑھنے والا حق نہ کہے یا سننے والا اس حق کے سننے میں غلطی کرے تو تلاوت حق نہ ہوگی۔

کلام خداوند عالم کی تلاوت کے سلسلہ میں تو ظاہر ہے کہ حق کے سوا کسی اور شئے کا وجود ہی نہیں ہے: **واللہ یقول الحق و ھو یھدی السبیل** (احزاب ۴) اللہ حق کہتا ہے اور وہی ہے جو راہ کی ہدایت ورہنمائی کرتا ہے۔

اس کا دوسرا رکن بھی حق ہے کیونکہ جو اسے لے کر آیا ہے، امین ہے اور اس کی امانت میں کبھی خیانت کی رسائی نہیں ہوسکتی: **مطاع ثم امین** (تکویر ۲۱) ملائکہ کا سردار اور فرمانروا (جبرئیل) امین وحی ہے اور بارگاہ خداوندی کے تمام مقرب فرشتے بہترین اور باعظمت سفیر ہیں: ...... **سفرۃ کرام بررۃ** (عبس ۱۵) یہ سفراء اور آیات کے پہنچانے والے امین اور صالح ونیکوکار ہیں۔ حق سنتے ہیں اور حق لے کر آتے ہیں۔

تیسرا رکن بھی یہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ معصوم اور مطہر ہیں کہ حق کے سوا اور کچھ نہیں سنتے اور یہ عظیم پیغمبرؐ لوگوں پر ایسی کتاب کی تلاوت کرتا ہے جس میں کبھی کسی غلطی، اشتباہ یا تناقض اور ٹکراؤ کی گنجائش ہی نہیں ہے بلکہ یہ کتاب مطہر ہے۔ سورۂ مبارکۂ بینہ میں ارشاد ہوتا ہے: **لم یکن الذین کفروا من اھل الکتاب والمشرکین منفکین حتی تأتیھم البینۃ** (بینہ ۱) کافرین اہل کتاب اور مشرکین دست بردار نہیں تھے یہاں تک کہ ان کی طرف بینہ اور روشن دلیل آئی۔

بینہ کون ہے؟

بینہ وہ پیغمبرؐ ہے جو خداوند عالم کی جانب سے مبعوث ہوا ہے کہ لوگوں پر پاک اور مطہر کتابوں کی تلاوت کرے۔ سورۂ بینہ کی دوسری آیت میں ارشاد ہے: **رسول من اللہ یتلوا صحفاً مطھرہ** (بینہ ۲) خدا کی جانب سے ایک پیغمبر ہے جو لوگوں پر آسمانی کتاب (قرآن) سے مطہر و پاکیزہ صحیفوں کی تلاوت کرتا ہے۔

یہ مطہر و پاکیزہ کتاب ہے، کیونکہ اس میں جھوٹ، تضاد، بے دلیل اور بیہودہ باتیں نہیں پائی جاتی ہیں۔ یہ ساری باتیں رجس و کثافت اور شرک و وسواس ہے جو حریم قرآن سے دور ہیں۔ لہٰذا قرآن مطہر و پاکیزہ ہے اور ان پاکیزہ صحیفوں میں مطالب واحکام بیان کیئے گئے ہیں جو لوگوں کے لیئے ''قیم'' اور ان پر حاکم ہیں: **فیھا کتب قیمہ** (بینہ ۲) اس میں سیدھی راہ کی ہدایت کرنے والی بالادست کتابیں ہیں۔

لوگوں کو حکم الٰہی کی سرپرستی میں رہنا چاہیئے۔ پس یہ صحیفے، سورے اور آیتیں لوگوں کی قیم وسرپرست ہیں اور رسولؐ خدا لوگوں کی قیم کو ان تک پہنچارہے ہیں۔ یہ کتب قیمہ نہ صرف پیغمبر اکرمؐ کی مطہر و پاکیزہ زبان سے لوگوں کے کانوں میں پہنچنے تک مطہر ہیں بلکہ غیب سے پیغمبر اکرمؐ کے گوش گزار ہونے کی منزل میں بھی مطہر ومکرم ہیں۔ سورۂ عبس میں ارشاد ہوتا ہے: **فی صحف مکرمۃ مرفوعۃ مطھرۃ** (عبس ۱۳) یہ آیتیں اس قدر بلند ہیں کہ کسی کے ہاتھ ان تک نہیں پہنچتے نہ انہیں کما حقہ سمجھا جاسکتا ہے اور نہ ان کے جیسی آیتیں بنانا ممکن ہے۔ یہ کتاب مرفوع ہے یعنی بلند ہے اور کسی کی دسترس میں نہیں ہے کہ انسان اس کا مثل و مانند لاسکے اور اس میں تحریف کرے۔ ساتھ ہی یہ تمام آلودگیوں سے بھی پاک ومنزہ اور مطہر ہے نیز اس وحی کے لانے والے بھی امین، کریم اور صالح ہیں: **بایدی سفرۃ کرام بررۃ** (عبس ۱۵) کریم وصالح سفیروں یعنی ملائکہ کے ہاتھوں۔

برحق تلاوت

بنابرایں ہم سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ قرآن کی ''بالحق'' تلاوت کریں۔ قرآن میں جب گذشتہ ادیان کے مومنین کی مدح و ستائش کی جاتی ہے تو ارشاد ہوتا ہے: **الذین آتیناھم الکتاب یتلو نہ حق تلاوتہ** (بقرہ ۱۲۱) جن کو ہم نے کتاب عطا کی تو وہ اس کے حق کے ساتھ اس کی تلاوت کرتے ہیں۔

تلاوت کا حق کیا ہے؟

تلاوت کا حق سورۂ انفال میں بیان کیا گیا ہے، جہاں مسلمانوں کے بارہ میں ارشاد ہوتا ہے: **اذا تلیت علیھم آیاتہ زادتھم ایمانا** (انفال ۲) یعنی جب ان پر خدا کی آیتوں کی تلاوت کی جاتی ہے تو وہ ان کے ایمان میں اضافہ کر دیتی ہیں۔ یہ تلاوت برحق ہے جو مومنین کے ایمان میں اضافہ کرتی ہے۔ ایسی تلاوت نہیں جو باحق ہی نہ ہو کہ روایت میں ہے: **رب تال للقرآن والقرآن یلعنہ** ایسے بھی ہیں جو قرآن پڑھتے ہیں اور قرآن ان پر لعنت کرتا ہے۔

بنابرایں اگر خداوند عالم نے پیغمبر اکرمؐ کے لیئے یہ تین صفات اور تین عہدے بیان فرمائے ہیں تو خود اس نے آنحضرتؐ کے لیئے بھی یہ تین مرحلے رکھے ہیں۔ سب سے پہلے ان پر برحق تلاوت فرمائی۔ اس کے بعد انہیں اس پر مامور کیا کہ آپ بھی لوگوں کے لیئے ان مطہر و پاکیزہ صحیفوں کی تلاوت فرمائیں۔ حضرتؐ کو علم و حکمت عطا فرمائی: **و علمک ما لکم تکن تعلم** (نساء ۱۱۳) اور آپ کو وہ علم عطا کیا جو آپ نہیں جانتے تھے۔ اس کے بعد ان سے مطالبہ کیا گیا کہ آپؐ لوگوں کو بھی علم و حکمت سے آشنا بنائیں: **و یعلمھم الکتاب والحکمۃ** (جمعہ ۲) خداوند عالم نے آنحضرتؐ کو آیۂ تطہیر کی بنیاد پر طاہر و مطہر بنایا اس کے بعد فرمایا کہ تم بھی لوگوں کا تزکیہ کرو اور انہیں پاکیزہ بناؤ۔ سورۂ نور میں پروردگار عالم کا ارشاد گرامی کہ اگر فضل خدا نہ ہوتا تو کوئی شخص زکی و پاکیزہ نہ ہوتا، اسی نکتہ کی طرف اشارہ ہے: **لولا فضل اللہ علیکم و رحمتہ ما زکیٰ منکم من احد ابدا** (نور ۲۱) یعنی اگر خدا کا فضل اور اس کی رحمت شامل حال نہ ہوتی تو کوئی بھی روح بالیدگی اور تزکیۂ نفس کے مرحلہ تک نہ پہنچ پاتا۔

صرف تزکیہ نفس ہی خداوند عالم کی جانب سے نہیں ہے بلکہ تمام کمالات اس کی جانب سے ہیں اور کوئی انسان یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ یہ کمال خود اس نے حاصل کیا ہے، بلکہ جو کچھ ہے اس کے فضل اور اس کی عنایت سے ہے۔ فرق یہ ہے کہ بعض افراد رفتہ رفتہ اس فیضان الٰہی سے بہرہ ور ہوتے ہیں اور بعض ایک ہی مرتبہ میں۔ بعض اس لطف الٰہی سے کم فیضیاب ہوتے ہیں اور بعض زیادہ۔

سننے والے کی طہارت

جیسا کہ بیان ہو چکا ہے سفراء الٰہی اور خدا کے برگزیدہ فرشتے ان مطہر و پاکیزہ صحیفوں کو پیغمبر مطہرؐ پر تلاوت کرتے ہیں۔ لہٰذا تلاوت کی منزل میں بھی اسی انسان کو صحیح تلاوت کی توفیق حاصل ہوتی ہے جو طاہر و پاکیزہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ ''**طھروا افواھکم فانھا طرق القرآن**'' اپنے دہنوں کو پاک رکھو کیونکہ یہ قرآن کی راہیں ہیں، یعنی ایسا نہیں ہے کہ انسان دن میں جو کچھ اس کے منہ میں آئے کہہ دے اور رات میں حق تلاوت کے ساتھ قرآن پڑھنے کی توفیق بھی پیدا کرلے۔ قرآن ایک مطہر و پاکیزہ صحیفہ ہے اسے پاکیزہ راہ سے گزرنا چاہیئے۔ پس انسان کا دہن اسی وقت قرآن کی گزرگاہ بن سکتا ہے جب پاک ہو۔

دہن کیونکر پاک ہو؟

۱۔ بری اور بیہودہ باتیں دہن سے باہر نہ آئیں

۲۔حرام غذا منہ میں داخل نہ ہو

جی ہاں! تلاوت قرآن کا گزر پاک دہن سے ہونا چاہیئے ورنہ گندے نالے میں بہنے والا صاف وشفاف پانی آخر کار گندا ہو جا ئے گا۔ اگر قرآن ناپاک دہن سے جاری ہوتو **ویل للمصلین** (ماعون ۴) ''وائے ہو ان نمازیوں کے لیئے'' کا مصداق اس پر صادق آئے گا۔

یہ جو قرآن میں ارشاد ہے: **لاتقربوا الصلوٰۃ وانتم سکاریٰ** (نساء ۴۳) ''مستی کی حالت میں نماز کے قریب مت ہو یا نماز نہ پڑھو۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ کہہ رہے ہو اسے سمجھو۔ البتہ اگر انسان نہ سمجھے کہ کیا کہہ رہا ہے، اس کی نماز صحیح تو ہے لیکن یا سرے سے مقبول نہیں ہے یا پوری طرح قبول نہیں ہے کیونکہ ہم سے صرف تلاوت یا صرف قرأت کا مطالبہ نہیں کیا گیا ہے ''**حتی تعلموا ماتقولون**'' (نساء ۴۳) بلکہ یہ بھی چاہا گیا ہے کہ تم سمجھو بھی کہ کیا کہہ رہے ہو۔ پس اگر انسان یہ نہ جانے کہ کیا کہہ رہا ہے، وہ صرف نیت کرکے اور تکبیرۃ الاحرام کہہ کر نماز شروع کرتا ہے اور سلام پر نماز تمام کرتا ہے۔ یہ نماز فریضہ کو تو ادا کر دیتی ہے لیکن اہل تقویٰ کا قرب اسے حاصل نہیں ہوتا کیونکہ وہ جوانی کی مستی، جاہ ومنصب کا نشہ یا دنیا کا غرور رکھتا ہے۔ اور یہ کوئی ہنر نہیں ہے کہ انسان کی زیادہ سے زیادہ کوشش یہ رہے کہ اپنے آپ کو عذاب سے نجات دلا سکے۔ اس لیئے کہ خداوند عالم بہت سے لوگوں کو مثلاً بچوں، دیوانوں ومجنونوں اور فکری اعتبار سے بودے افراد کو جو مسائل سمجھنے کے قابل نہیں ہیں، قیامت کے دن عذاب میں مبتلا نہیں کرے گا اور دوزخ میں نہیں ڈالے گا۔

اس طرح یہ بات ظاہر ہے کہ اس شخص کو جو یہ نہیں جانتا کہ کیا کہہ رہا ہے اور کس سے ہم کلام ہے، اہل تقویٰ والی تقرب کی منزل نصیب نہیں ہے۔

اپنی تطہیر اور تزکیہ کی راہ میں سب سے پہلا قدم یہ ہے کہ انسان اپنا غرور اور اپنی انانیت چکنا چور کردے۔ یہ اقدام طہارت نفس کے لیئے زمین ہموار کرتا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم میں کبھی ارشاد ہوتا ہے: ہم نے بارش کے پانی کو اس لیئے نازل کیا کہ وہ پاک کرے اور کبھی ارشاد ہوتا ہے: نماز کے وقت اگر پانی تمہیں میسر نہ ہو تو خاک پر تیمم کرو۔ خدا تمہیں پاک کرنا چاہتا ہے۔ یہ انسان جس نے اپنے چہرہ پر خاک ملی ہے اور اپنے غرور کو توڑ ڈالا ہے، خدا اسے پاک کرنا چاہتا ہے، اب یہ ظاہری تطہیر نہیں ہے۔

تلاوت کی راہیں

وہ روایت جس میں ارشاد ہوا ہے کہ: ''اپنے دہنوں کو پاک رکھو کہ یہ قرآن کی راہیں ہیں۔'' البتہ کان، آنکھیں، ہاتھ، اور دیگر اعضا بھی قرآن کی راہیں ہیں۔ وہ کان جنہوں نے غیبت سنی ہے اور اس کی مخالفت نہیں کی ہے، وہ کان جنہوں نے اجنبی عورتوں کی آوازوں میں شہوت انگیز نغمے سنے ہیں اور وہ کان جنہوں نے دوسروں کی ہزاروں ناروا تہمتیں اور جھوٹے الزامات سنے ہیں اور ان کی کوئی مخالفت نہیں کی ہے، آیات الٰہی کو بھلا کیوں کر سن سکتے ہیں؟!

رسول اکرمؐ سے ایک روایت نقل ہے۔ حضرتؐ فرماتے ہیں: ''**اعطوا العین حقھا**'' آنکھوں کو اس کا حق ادا کرو۔ لوگوں نے دریافت کیا، آنکھوں کا حق کیا ہے؟ فرمایا: ''**النظر الی المصحف**'' قرآن کو دیکھنا۔ کیونکہ قرآن کو دیکھ کر اس کی تلاوت کرنا حدیث کے مطابق عبادت ہے۔ اگر نگاہیں پاک نہ ہوں تو انسان قرآن پر نگاہ کرنے کی توفیق پیدا نہیں کرسکتا۔ وہ خیانت کار آنکھیں جنہوں نے

ایک عمر شیطان کی ولایت وسر پرستی میں بسر کی ہے کلام پروردگار کو دیکھنے کی توفیق سے محروم رہتی ہیں۔ جو ہاتھ ناپاک ہے اسے قرآن کی طرف نہیں بڑھنا چاہیئے'لا یمسہ الا المطہرون' (واقعہ ۷۹) قرآن کو صرف طاہرو پاکیزہ افراد ہی مس کرتے ہیں۔

مذکورہ بالا باتوں سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ تلاوت قرآن مجید کے لیئے طہارت حتی سننے کی منزل میں بھی شرط ہے یعنی اگر کسی کان نے باطل باتیں سنی ہوں اور اس کی تطہیر نہ ہوئی ہو ایسی صورت میں اگر آیات الٰہی کی تلاوت بھی اس کے سامنے کی جائے گی تب بھی وہ انہیں نہیں سن سکتا۔ وفی آذانھم وقراً (انعام ۲۵) اور ہم نے ان کے کانوں میں بہرا پن کر دیا ہے کہ قرآن کو سمجھ نہ سکیں۔

کون سے کان کلام الٰہی کو قبول کرتے ہیں؟

''وتعیھا اذن واعیۃ'' (حاقہ ۱۲) اور اہل ہوش کے کان اس پند ونصیحت کو سنتے اور یاد کرتے ہیں۔ یعنی وہی کان انبیاء کرام کی نصیحتوں اور یاددہانیوں کو سنتے اور آیات الٰہی کو قبول کرتے ہیں جو''وعاء'' ہیں یعنی ان باتوں کو یاد رکھتے ہیں۔ بعض کان معبر ہیں، ہر طرح کی بات قبول کر لیتے ہیں، یہ وکان ''وعاء'' اور اذن واعیۃ نہیں ہیں۔ اگر کان کو ایک غیر محسوس حجاب یا پردہ نہ چھپائے اور وہ واعیہ ہو تو وہ آیات الٰہی کو درک کر سکتا ہے۔

بعض پردے اور حجاب قابل محسوس نہیں ہیں بلکہ خود ہی پوشیدہ ہیں: واذا قرأت القرآن جعلنا بینک و بین الذین لایؤمنون بالاخرۃ حجابا مستورا (اسراء یا بنی اسرائیل ۴۵) اور جب تم نے قرآن کی تلاوت کی تو ہم نے تمہارے اور ان کے درمیان جو خدا و آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ایک پوشیدہ حجاب ڈال دیا یہاں مستور، ساتر کے معنی میں نہیں ہے جیسا کہ ادبیات جاہلی کے پیرو بعض اہل ادب کہتے ہیں، بلکہ یہ خود ایک پوشیدہ اور غیر محسوس حجاب ہے۔

جب حضرت علیؑ یا آٹھویں امامؑ سے (کیونکہ یہ روایت دونوں حضرات سے نقل ہوئی ہے) پوچھا گیا کہ ہم شب بیداری کی توفیق سے کیوں محروم ہیں؟ تو آپ نے فرمایا: ''دن کے گناہ اس کی اجازت نہیں دیتے کہ رات کو اٹھ کر عبادت کرو۔'' یہاں خود گناہ حجاب ہے لیکن یہ حجاب دیوار وغیرہ کی طرح دکھائی نہیں دیتا۔ چنانچہ اگر ایسا ہی حجاب کان میں بھی موجود ہو تو قرآن اس سے عبور نہیں کر سکتا اور وہ کان ''واعیہ'' یعنی سن کر محفوظ رکھنے والا نہیں ہے۔ پس ہمیں اپنے کان آنکھوں اور دہن سے ان حجابوں کو دور کرنے کی کوشش کرنا چاہیئے تاکہ قرآن کی راہیں پاک ہوں اور الٰہی آیات ہمارے اندر اثر کر سکیں۔

نتیجہ

اس بحث کا نتیجہ یہی نکلا کہ رسولؐ خدا کے لیئے تین امر بطور احسن اور بدرجۂ اتم انجام پائے اور تین منصب انہیں عطا ہوئے ان پر برحق الٰہی آیات کی تلاوت کی گئی۔ خداوند عالم نے انہیں علم عطا فرمایا اور پاکیزہ ومطہر قرار دیا۔ اس کے بعد فرمایا کہ تم بھی یوں ہی لوگوں پر آیات الٰہی کی تلاوت کرو، انہیں علم وحکمت کی تعلیم دو اور ان کے قلوب کو پاکیزہ بناؤ اور ناپاکی سے محفوظ رکھو تاکہ ہر شخص اپنے اپنے اعتبار سے چاہے مقام تلات میں یا تعلیم اور تزکیۂ نفس کی منزل میں ۔ کہ یہ تینوں مراتب باہم مربوط ہیں۔۔۔ الٰہی فیض حاصل کر سکے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

''اگر کوئی قرآن کا ایک حرف بھی توجہ سے سن لے تو اللہ اسے دس نیکیاں عطا فرماتا ہے اور دس گناہ معاف کرتا ہے۔

حضرت حسن مجتبیٰ علیہ السلام

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء مولانا سید علی نقی النقوی طاب ثراہ

نام ونسب :۔ حسنؑ نام مجتبیٰ لقب اور ابو محمد کنیت تھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معزز بیٹی حضرت فاطمہ زہراؑ کے بطن سے حضرت امیر المومنین علیؑ ابن ابیطالبؑ کے بڑے فرزند تھے۔

ولادت :۔ ۱۵؍رمضان المبارک کو ہجرت کے تیسرے سال آپ کی ولادت ہوئی ۔ رسولؐ کے گھر میں آپ کی پیدائش اپنی نوعیت کی پہلی خوشی تھی ۔ جب مکہ معظمہ میں رسولؐ کے بیٹے یکے بعد دیگرے دنیا سے جاتے رہے اور سوائے لڑکی کے آپ کی اولاد میں کوئی نہ رہا تو مشرکین طعنے دینے لگے اور آپ کو معاذ اللہ ابتر یعنی مقطوع النسل کہنے لگے اس سے آپ کو بڑا صدمہ پہنچا اور آپ کی تسلی کے لئے قرآن مجید میں سورۂ کوثر نازل ہوا جس میں آپ کو خوش خبری دی گئی کہ خدا نے آپ کو کثرت اولاد عطا فرمائی ہے اور مقطوع النسل آپ نہیں بلکہ آپ کا دشمن ہوگا۔

حضرت امام حسن علیہ السلام کی مدینہ میں آنے کے تیسرے ہی سال پیدائش گویا سورۂ کوثر کی پہلی تفسیر تھی ۔ دنیا جانتی ہے کہ امام حسنؑ اور ان کے چھوٹے بھائی امام حسینؑ کے ذریعہ سے اولادِ رسولؐ کی وہ کثرت ہوئی کہ باوجود ان کوششوں کے جو دشمنوں کی طرف سے اس خاندان کے ختم کرنے کی ہمیشہ ہوتی رہیں جن میں ہزاروں کو سولی دے دی گئی ہزاروں تلواروں سے قتل کیے گئے اور کتنوں کو زہر دیا گیا اس کے باوجود آج تک دنیا آلِ رسولؐ کی نسل سے چھلک رہی ہے عالم کا کوئی گوشہ مشکل سے ایسا ہوگا جہاں اس خاندان کے افراد موجود نہ ہوں جبکہ رسولؐ کے دشمن جن کی اس وقت کثرت سے اولاد موجود تھی ایسے فنا ہوئے کہ نام ونشان بھی ان کا کہیں نظر نہیں آتا ۔ یہ ہے قرآن کی سچائی اور رسولؐ کی صداقت کا زندہ ثبوت جو دنیا کی آنکھوں کے سامنے ہمیشہ کے لئے موجود ہے اور اس لئے امام حسن علیہ السلام کی پیدائش سے پیغمبرؐ کو ویسی ہی خوشی نہیں ہوئی جیسی ایک نانا کو نواسے کی ولادت سے ہونا چاہیے بلکہ آپ کو خاص مسرت یہ ہوئی کہ آپ کی سچائی کی پہلی نشانی دنیا کے سامنے آئی ۔ ساتویں دن عقیقہ کی رسم ادا ہوئی اور پیغمبرؐ نے بحکم خدا اس فرزند کا نام حسنؑ رکھا ۔ یہ نام اسلام کے پہلے نہیں ہوا کرتا تھا یہ سب سے پہلے پیغمبرؐ کے اسی فرزند کا نام قرار پایا ۔ یا حسینؑ ان کے چھوٹے بھائی کا نام بھی بس انہی سے مخصوص تھا، ان کے پہلے کسی کا یہ نام نہ ہوا تھا۔

تربیت :۔ حضرت امام حسن علیہ السلام کو تقریباً آٹھ برس اپنے نانا رسول اللہ کے سایۂ عاطفت میں رہنے کا موقع ملا رسالت مآبؐ اپنے اس نواسے سے جتنی محبت فرماتے تھے اسکے واقعات دیکھنے والوں نے ہمیشہ یاد رکھے اکثر حدیثیں محبت اور فضیلت کی حسنؑ اور حسینؑ دونوں صاحب زادوں میں مشترک ہیں مثلاً حسنؑ اور حسینؑ جوانان بہشت کے سردار ہیں ۔ دونوں گوشوارۂ عرش ہیں، یہ دونوں میرے گلدستے ہیں، خداوندا میں ان دونوں سے محبت رکھتا ہوں تو بھی ان کو محبوب رکھنا اور اس طرح کے بے شمار ارشادات پیغمبرؐ کے دونوں نواسوں کے بارے میں کثرت سے ہیں ۔ ان کے

علاوہ ان کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ عام قاعدہ یہ ہے کہ اولاد کی نسبت باپ کی جانب ہوتی ہے مگر پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ان دونوں نواسوں کی یہ خصوصیت صراحت کے ساتھ بتائی کہ انہیں میرا نواسا ہی نہیں بلکہ فرزند کہنا درست ہے۔

یہ حدیث حضرت کی تمام اسلامی حدیث کی کتابوں میں درج ہے حضرت نے فرمایا: خدا نے ہر شخص کی اولاد کو اسکے باپ کے صلب میں قرار دیا اور میری اولاد کو اس نے علیؑ ابن ابی طالبؑ کی صلب سے قرار دیا پھر بھلا ان بچوں کی تربیت میں پیغمبرؐ کس قدر اہتمام صرف کرنا ضروری سمجھتے ہوں گے جبکہ خود بچے بھی وہ تھے جنہیں قدرت نے طہارت وعصمت کا لباس پہنا کر بھیجا تھا۔ ایک طرف آئینے اتنے صاف اس پر رسولؐ کے ہاتھ کی جلا، نتیجہ یہ تھا کہ بچے کم سنی ہی میں نانا کے اخلاق و اوصاف کی تصویر بن گئے ۔خود حضرت نے ان کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ حسن میں میرا رعب وداب اور شان سرداری ہے اور حسینؑ میں میری سخاوت اور میری جرأت ہے ۔شان سرداری گو مختصر لفظ ہے مگر اس میں بہت سے اوصاف وکمال کی جھلک نظر آرہی ہے اس کے ساتھ ساتھ مختلف صورتوں سے رسولؐ نے بحکم خدا اپنے مشن کے کام میں ان کو اسی بچپن کے عالم میں شریک بھی کیا جس سے یہ ثابت بھی ہوا کہ پیغمبرؐ اپنے بعد بمنشاء الٰہی حفاظت اسلام کی مہم کو اپنے ہی اہل بیتؑ کے سپرد کرنا چاہتے ہیں ۔اس کا ایک موقع مباہلہ کے میدان میں تھا حضرت امام حسنؑ بھی اپنے نانا کے ساتھ ساتھ تھے

۲ ربیع الاول ۱۱ھ کو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات ہو گئی اور امام حسن علیہ السلام اس مسرت اور اطمینان کی زندگی سے محروم ہو گئے ۔نانا کی وفات کے تھوڑے ہی دن بعد امام حسنؑ کو اپنی مادر گرامی حضرت فاطمہ زہراؑ کی وفات کا صدمہ اٹھانا پڑا ۔اب حسنؑ کے لئے گہوارہ تربیت اپنے مقدس باپ حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ کی ذات تھی ۔حسنؑ اسی دور میں جوانی کی حدوں تک پہونچے اور کمال شباب کی منزلوں کو طے کیا پچیس برس کی خانہ نشینی کے بعد جب حضرت علی ابن ابیطالب علیہ السلام کو مسلمانوں نے خلیفۂ ظاہری کی حیثیت سے تسلیم کیا اور اس کے بعد جمل، صفین اور نہروان کی لڑائیاں ہوئیں تو ہر ایک جہاد میں حسن علیہ السلام اپنے والد بزرگوار کے ساتھ ساتھ تھے بلکہ بعض موقعوں پر جنگ میں آپ نے کارنمایاں بھی دکھلائے ۔

خلافت :۔ ۲۱؍ماہ رمضان ۴۰ھ میں حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی وفات ہوئی اس وقت تمام مسلمانوں نے مل کر حضرت امام حسن علیہ السلام کی خلافت تسلیم کی ۔آپ پر اپنے والد بزرگوار کی شہادت کا بڑا اثر تھا ۔سب سے پہلا خطبہ جو آپ نے ارشاد فرمایا اس میں حضرت علی ابن ابی طالبؑ کے فضائل ومناقب تفصیل کے ساتھ بیان کئے ۔ جناب امیرؑ کی سیرت اور مال دنیا سے پرہیز کا تذکرہ کیا اس وقت آپ پر گریہ کا اتنا غلبہ ہوا کہ گلے میں پھندا پڑ گیا اور تمام لوگ بھی آپ کے ساتھ بے اختیار رونے لگے ۔پھر آپ نے اپنے ذاتی اور خاندانی فضائل بیان کئے عبداللہ ابن عباس نے کھڑے ہو کر تقریر کی اور لوگوں کو بیعت کی دعوت دی سب نے انتہائی خوشی اور رضا مندی کے ساتھ بیعت کی آپ نے مستقبل کے حالات کا صحیح اندازہ کرتے ہوئے اسی وقت لوگوں سے صاف صاف یہ شرط کر دی کہ ''اگر میں صلح کروں تو تم کو صلح کرنا ہوگی اور اگر میں جنگ کروں تو تمہیں میرے ساتھ مل کر جنگ کرنا ہوگی ۔'' سب نے اس شرط کو قبول کر لیا آپ نے انتظام حکومت اپنے ہاتھ میں لے لیا ۔اطراف میں عمال مقرر کئے ، حکام متعین کئے اور مقدمات کے فیصلے کرنے لگے

یہ وقت وہ تھا کہ دمشق میں امیر شام معاویہ کا تخت سلطنت پر قبضہ مضبوط ہو چکا تھا۔حضرت علی ابن ابی طالبؑ کے ساتھ صفین میں جو لڑائیاں امیر شام کی ہوئی تھیں ان کا نتیجہ تحکیم کی سازشانہ کاروائی کی بدولت امیر شام کے موافق نکل چکا تھا ادھر حضرت علی ابن ابی طالبؑ کی سلطنت کے اندر جہاں اب امام حسنؑ حکمراں ہوئے تھے باہمی تفرقے اور بددلی پیدا ہو چکی تھی خود جناب امیرؑ کے احکام کی تعمیل میں جس طرح کوتاہیاں کی جاتی تھیں وہ حضرت کے آخر عمر کے خطبوں سے ظاہر ہے۔خوارج نہروان کا فتنہ مستقل طور پر بے اطمینانی کا باعث بنا ہوا تھا جن کی اجتماعی طاقت کو اگرچہ نہروان میں شکست ہو گئی تھی مگر ان کے منتشر افراد اب بھی ملک کے امن وامان کو صدمہ پہنچانے پر تلے ہوئے تھے یہاں تک کہ بظاہر اسی جماعت کا ایک شخص تھا جس نے حضرت امیرؑ کے سر پر مسجد میں ضربت لگائی اور جس کے صدمہ سے آپ کی وفات ہوئی تھی۔

ابھی ملک حضرت علی ابن ابی طالبؑ کے غم میں سوگوار تھا اور حضرت امام حسنؑ پورے طور پر انتظامات بھی نہ کر چکے تھے کہ امیر شام کی طرف سے آپ کی مملکت میں دراندازی شروع ہو گئی اور ان کے خفیہ کارکنوں نے اپنی کارروائیاں جاری کر دیں چنانچہ ایک شخص قبیلہ حمیر کا کوفہ میں اور ایک شخص بنی قین میں سے بصرہ میں پکڑا گیا یہ دونوں اس مقصد سے آئے تھے کہ یہاں کے حالات سے دمشق میں اطلاع دیں اور فضا کو امام حسنؑ کے خلاف ناخوشگوار بنائیں غنیمت ہے کہ اس کا انکشاف ہو گیا۔حمیر والا آدمی کوفہ میں ایک قصائی کے گھر سے اور قین والا آدمی بصرہ میں بنی سلیم کے یہاں سے گرفتار کیا گیا اور دونوں کو جرم کی سزا دی گئی اس واقعہ کے بعد حضرت امام حسنؑ نے معاویہ کو ایک خط لکھا جس کا مضمون یہ تھا کہ ''تم اپنی دراندازیوں سے باز نہیں آتے تم نے لوگ بھیجے ہیں کہ میرے ملک میں بغاوت پیدا کرائیں اور اپنے جاسوس یہاں پھیلا دیئے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ تم جنگ کے خواہش مند ہو ایسا ہو تو پھر تیار رہو یہ منزل کچھ دور نہیں ہے نیز مجھ کو خبر ملی ہے کہ تم نے میرے باپ کی وفات پر طعن وتشنیع کے الفاظ کہے۔یہ ہرگز کسی ذی ہوش آدمی کا کام نہیں ہے، موت سب کے لیئے ہے آج ہمیں اس حادثے سے دوچار ہونا پڑا تو کل تمہیں ہوگا اور حقیقت یہ ہے کہ ہم اپنے مرنے والے کو مرنے والا سمجھتے نہیں وہ تو ایسا ہے جیسے ایک منزل سے منتقل ہو کر دوسری منزل میں جا کر آرام کی نیند سو جائے۔''

اس خط کے بعد امیر شام اور امام حسنؑ کے درمیان بہت سے خطوط کی ردوبدل ہوئی۔امیر شام کو اپنے جاسوسوں کے ذریعہ سے اہل کوفہ کے باہمی تفرقہ اور بددلی اور عملی کمزوریوں کا علم ہو گیا۔اس لئے وہ سوچے کہ یہی موقع ہے کہ عراق پر حملہ کر دیا جائے۔چنانچہ وہ اپنی فوجوں کو لے کر عراق کے حدود تک پہنچ گئے اس وقت حضرت امام حسنؑ نے بھی مقابلہ کی تیاری کی اور حجر بن عدی کو بھیجا کہ وہ دورہ کر کے اطراف ملک کے حکام کو مقابلے کے لئے آمادہ کریں اور لوگوں کو جہاد کے لئے تیار کریں مگر جو خیال تھا وہی ہوا کہ عام طور پر سردمہری سے کام لیا گیا تھوڑی فوج تیار ہوئی تو ان میں کچھ فرقہ خوارج کے لوگ تھے کچھ شورش پسند اور مال غنیمت کے طلبگار اور کچھ لوگ صرف اپنے سرداران قبائل کے دباؤ سے شریک تھے بہت کم وہ لوگ تھے جو واقعی حضرت علیؑ اور امام حسنؑ کے شیعہ سمجھے جاسکتے ہوں۔

ادھر معاویہ نے عبداللہ ابن عامر ابن کریز کو آگے روانہ کیا اور اس نے مقام انبار میں جا کر چھاؤنی چھائی۔ادھر حضرت امام حسنؑ اس کے مقابلہ کے لئے روانہ ہوئے اور مقام دیر کعب کے قریب ساباط میں قیام کیا۔یہاں پہنچ کر آپ نے لوگوں کی حالت کا جائزہ

لینے کے لئے سب کو جمع کر کے ایک خطبہ ارشاد فرمایا جس کا مضمون یہ تھا کہ ''دیکھو مجھے کسی مسلمان سے کینہ نہیں ہے میں تمہارا اتنا ہی بہی خواہ ہوں جتنا خود اپنی ذات کی نسبت مجھے ہونا چاہیے۔ میں تمہارے بارے میں ایک فیصلہ کن رائے قائم کر رہا ہوں امید ہے کہ تم میری رائے سے انحراف نہ کرو گے میں دیکھ رہا ہوں کہ تم میں سے اکثر کی ہمت جہاد سے پست ہو گئی ہے اور میں کسی طرح یہ صحیح نہیں سمجھتا کہ تمہیں بادل ناخواستہ کسی مہم پر مجبور کروں'' اس تقریر کا ختم ہونا تھا کہ مجمع میں ہنگامہ پیدا ہو گیا۔ یقیناً علیؑ ایسے بہادر باپ کا بہادر فرزند تن تنہا اس ہنگامہ آور جماعت کا مقابلہ کرنے کے لئے کافی تھا ـــــ اگر یہ کھلم کھلا دشمنوں کی جماعت ہوتی مگر اس کے پہلے خود حضرت علیؑ بھی اس وقت بظاہر بے بس ہو گئے تھے جب نیزوں پر قرآن اونچے کئے جانے کے بعد صفین میں خود آپ کی فوج کے آدمی آپ کو گھیر کر کھڑے ہو گئے تھے کہ آپ جنگ کو روکئے نہیں تو ہم آپ کو قید کر کے دشمن کے سپرد کر دیں گے اس وقت جناب امیر نے ایسا نہیں کیا کہ تلوار لے کر ان سے لڑنے لگتے بلکہ مجبوراً جنگ کو ملتوی فرمایا۔ اس سے زیادہ سخت صورت سے اس وقت امام حسنؑ کو سامنا کرنا پڑا کہ مجمع نے آپ پر حملہ کر دیا اور مصلا قدم کے نیچے سے کھینچ لیا۔ چادر آپ کے دوش سے اتار لی آپ گھوڑے پر سوار ہوئے اور آواز بلند کی کہاں ہیں ربیعہ اور ہمدان فوراً یہ دونوں جاں نثار قبیلے ادھر ادھر سے دوڑ پڑے اور لوگوں کو آپ سے دور کیا۔ آپ یہاں سے مدائن کی طرف روانہ ہوئے مگر جراح ابن قبیصہ اسدی ایک شخص انہی خوارج میں سے کمین گاہ میں چھپ گیا اور اس نے آپ پر خنجر سے حملہ کیا جس سے آپ کی ران زخمی ہو گئی حملہ آور گرفتار کیا گیا اور اسے سزا دی گئی۔ عرصہ تک مدائن میں علاج ہونے کے بعد آپ اچھے ہوئے اور پھر معاویہ کی فوج سے مقابلہ کی تیاری کی۔

صلح:۔ امیر شام کو حضرت امام حسن علیہ السلام کی فوج کی حالت اور لوگوں کی بے وفائی کا حال معلوم ہو چکا تھا اس لئے وہ سمجھتے تھے کہ امام حسن علیہ السلام کے لئے جنگ کرنا ممکن نہیں ہے مگر اس کے ساتھ وہ یہ بھی یقین رکھتے تھے کہ حضرت امام حسنؑ کتنے ہی بے بس اور بے کس ہوں مگر وہ علیؑ و فاطمہؑ کے بیٹے اور پیغمبرؐ کے نواسے ہیں اس لئے وہ ایسے شرائط پر ہرگز صلح نہ کریں گے جو حق پرستی کے خلاف ہوں اور اور جن سے باطل کی حمایت ہوتی ہو اس کو نظر میں رکھتے ہوئے انہوں نے ایک طرف تو آپ کے ساتھیوں کو عبداللہ ابن عامر کے ذریعہ سے یہ پیغام دلوایا کہ اپنی جان کے پیچھے نہ پڑو اور خوں ریزی نہ ہونے دو۔ اس سلسلے میں کچھ لوگوں کو رشوتیں بھی دی گئیں اور کچھ بزدلوں کو اپنی تعداد کی زیادتی سے خوف زدہ کیا گیا اور دوسری طرف حضرت امام حسنؑ کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ جن شرائط پر کہیں انہی شرائط پر میں صلح کے لئے تیار ہوں۔

امام حسنؑ یقیناً اپنے ساتھیوں کی غداری کو دیکھتے ہوئے جنگ کرنا مناسب نہ سمجھتے تھے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ ضرور پیش نظر تھا کہ ایسی صورت پیدا ہو کہ باطل کی تقویت کا دھبا میرے دامن پر نہ آنے پائے۔ اس گھرانے کو حکومت واقتدار کی ہوس تو کبھی تھی ہی نہیں انہیں تو مطلب اس سے تھا کہ مخلوق خدا کی بہتری ہو اور حدود و حقوق الٰہی کا اجراء ہو اب امیر معاویہ نے جو آپ سے منہ مانگے شرائط پر صلح کرنے کے لئے آمادگی ظاہر کی تو اب مصالحت سے انکار کرنا شخصی اقتدار کی خواہش کے علاوہ اور کچھ نہیں قرار پا سکتا تھا۔ یہ کہ امیر شام صلح کے شرائط پر عمل نہ کریں گے بعد کی بات تھی جب تک صلح نہ ہوتی یہ انجام سامنے آ کہاں سکتا تھا اور حجت تمام کیونکر ہو سکتی تھی پھر بھی

آخری جواب دینے سے قبل آپ نے ساتھ والوں کو جمع کیا اور تقریر فرمائی ''آگاہ رہو کہ تم میں دو خوں ریز لڑائیاں ہو چکی ہیں جن میں بہت لوگ قتل ہوئے کچھ مقتول صفین میں ہوئے جن کے لئے آج تک رو رہے ہو اور کچھ مقتول نہروان کے جن کا معاوضہ طلب کر رہے ہو، اب اگر تم اپنی موت پر راضی ہو تو ہم اس پیغام صلح کو قبول نہ کریں اور ان سے اللہ کے بھروسے پر تلواروں سے فیصلہ کرائیں اور اگر زندگی کو دوست رکھتے ہو تو ہم اس کو قبول کر لیں اور تمہاری مرضی پر عمل کریں'' جواب میں لوگوں نے ہر طرف سے پکارنا شروع کیا کہ ''ہم زندگی چاہتے ہیں، ہم زندگی چاہتے ہیں آپ صلح کر لیجئے۔'' اس کا نتیجہ یہ تھا کہ آپ نے صلح کے شرائط مرتب کر کے معاویہ کے پاس روانہ کئے۔

شرائط صلح:۔ اس صلحنامہ کے مکمل شرائط حسب ذیل تھے:

۱۔ معاویہ حکومت اسلام میں کتاب خدا اور سنت رسولؐ پر عمل کریں گے۔

۲۔ یہ کہ معاویہ کو اپنے بعد کسی خلیفہ کے نام زد کرنے کا حق نہ ہوگا۔

۳۔ یہ کہ شام و عراق و حجاز و یمن سب جگہ کے لوگوں کے لئے امان ہوگی۔

۴۔ یہ کہ حضرت علیؑ کے اصحاب اور شیعہ جہاں بھی ہیں وہاں ان کے جان و مال اور ناموس و اولاد محفوظ رہیں گے۔

۵۔ معاویہ حسنؑ ابن علیؑ اور ان کے بھائی حسینؑ ابن علیؑ اور خاندان رسولؐ میں سے کسی کو بھی کوئی نقصان پہنچانے یا ہلاک کرنے کی کوشش نہ کریں گے نہ خفیہ طریقہ پر اور نہ علانیہ۔ اور ان میں سے کسی کو کسی جگہ دھمکایا اور ڈرایا نہیں جائے گا۔

۶۔ جناب امیر علیہ السلام کی شان میں کلمات نازیبا جو اب تک مسجد جامع اور قنوت نماز میں استعمال ہوتے رہے ہیں وہ ترک کر دیئے جائیں۔ آخری شرط کی منظوری میں معاویہ کو عذر ہوا تو یہ طے پایا کہ کم از کم جس موقع پر امام حسنؑ موجود ہوں اس موقع پر ایسا نہ کیا جائے۔ یہ معاہدہ ربیع الاول یا جمادی الاول ۴۱ھ کو عمل میں آیا۔

صلح کے بعد:۔ فوجیں واپس چلی گئیں معاویہ کی شہنشاہی ممالک اسلامیہ میں عمومی طور پر مسلم ہو گئی اور اب شام و مصر کے ساتھ عراق و حجاز، یمن اور ایران نے بھی اطاعت کر لی حضرت امام حسن علیہ السلام کو اس صلح کے بعد اپنے بہت سے ساتھیوں کی طرف سے جس طرح کے دل خراش اور توہین آمیز الفاظ کا سامنا کرنا پڑا ان کا برداشت کرنا انہی کا کام تھا وہ لوگ جو کل تک امیر المومنین کہہ کر تسلیم بجالاتے تھے آج ''مذل المومنین'' یعنی مومنین کی جماعت کو ذلیل کرنے والے کے الفاظ سے سلام کرنے لگے۔ پھر بھی امام حسنؑ نے صبر و استقلال اور نفس کی بلندی کے ساتھ ان تمام ناگوار حالات کو برداشت کیا اور معاہدہ پر سختی کے ساتھ قائم رہے مگر ادھر یہ ہوا کہ امیر شام نے جنگ کے ختم ہوتے ہی اور سیاسی اقتدار کے مضبوط ہوتے ہی عراق میں داخل ہو کر نخیلہ میں جسے کوفہ کی سرحد سمجھنا چاہیے قیام کیا اور جمعہ کے خطبہ کے بعد یہ اعلان کر دیا کہ ''میرا مقصد جنگ سے کوئی یہ نہ تھا کہ تم لوگ نماز پڑھنے لگو، روزے رکھنے لگو، حج کرو یا زکوٰۃ ادا کرو، یہ سب تم تو کرتے ہی ہو میرا مقصد تو بس یہ تھا کہ میری حکومت تم پر مسلم ہو جائے اور یہ مقصد میرا حسن کے اس معاہدہ کے بعد پورا ہو گیا اور باوجود تم لوگوں کی ناگواری کے خدا نے مجھے کامیاب کر دیا۔ رہ گئے وہ شرائط جو میں نے حسنؑ کے ساتھ کئے ہیں وہ سب میرے پیروں کے نیچے ہیں ان کا پورا کرنا یا نہ کرنا میرے

ہاتھ کی بات ہے۔'' مجمع میں ایک سناٹا چھایا ہوا تھا مگر اب کس میں دم تھا کہ وہ اس کے خلاف زبان کھولتا انتہا ہے کہ کوفہ میں امام حسنؑ اور امام حسینؑ کی موجودگی میں امیر شام نے حضرت امیر اور امام حسنؑ کی شان میں کلمات نازیبا استعمال کیے جن کو سن کر امام حسینؑ بھائی کی جانب سے جواب دینے

کے لئے کھڑے ہو گئے مگر امام حسنؑ نے آپ کو بٹھا دیا اور خود کھڑے ہو کر نہایت مختصر اور جامع الفاظ میں امیر شام کی تقریر کا جواب دیا۔ اسی طرح جتنی معاہدہ کی شرطیں تھیں امیر شام نے سب کی مخالفت کی اور کسی ایک پر بھی عمل نہیں کیا۔

باوجودیکہ آپ بالکل خاموشی کی زندگی گزار رہے تھے مگر آپ خود بھی اس دور میں بنی امیہ کی ایذا رسانیوں سے محفوظ نہیں تھے۔ ایک طرف غلط پروپیگنڈے اور بے بنیاد الزامات جن سے ان کی بلندی مرتبہ پر عام نگاہوں میں حرف آئے مثلاً کثرت ازدواج اور کثرت طلاق یہ چیز اپنی جگہ پر شریعت اسلام میں جائز ہے مگر بنی امیہ کے پروپیگنڈے نے اس کو حضرت امام حسنؑ کی نسبت ایسے ہولناک طریقہ پر پیش کیا جو ہرگز قابل قبول نہیں ہے۔ دوسرے بنی امیہ کے ہواخواہوں کا برابر تاؤ، سخت کلامی اور دشنام دہی اس کا اندازہ امام حسینؑ کے ان الفاظ سے ہوتا ہے جو آپ نے مروان سے فرمائے تھے جب امام حسنؑ کے جنازے کے ساتھ مروان رو رہا تھا امام حسین علیہ السلام نے فرمایا ''آج تم روتے ہو حالانکہ اس کے پہلے تم انہیں غم وغصہ کے گھونٹ پلاتے تھے جنہیں دل ہی خوب جانتا ہے۔'' مروان نے کہا ٹھیک ہے مگر وہ سب میں ایسے انسان کے ساتھ کرتا تھا جو اس پہاڑ سے زیادہ قوت برداشت رکھنے والا تھا۔

اخلاق و اوصاف :۔ امام حسنؑ کی ایک غیر معمولی صفت جس کے دوست اور دشمن سب معترف تھے وہ یہی حلم کی صفت تھی جس کا اقرار ابھی مروان کی زبان سے آپ سن چکے ہیں۔ حکومت شام کے ہواخواہ صرف اس لیے جان بوجھ کر سخت کلامی اور بدزبانی کرتے تھے کہ امام حسنؑ کو غصہ آجائے اور کوئی ایسا اقدام کر دیں جس سے آپ پر عہد شکنی کا الزام عائد کیا جا سکے اور اس طرح خوں ریزی کا ایک بہانہ ہاتھ آئے مگر آپ ایسی صورتوں میں حیرتناک قوت برداشت سے کام لیتے تھے جو کسی دوسرے انسان کا کام نہیں ہے۔ آپ کی سخاوت اور مہمان نوازی بھی عرب میں مشہور تھی آپ نے تین مرتبہ اپنا تمام مال راہ خدا میں لٹا دیا اور دو مرتبہ تمام اپنی ملکیت، یہاں تک کہ اثاث البیت اور لباس تک کو آدھوں آدھ راہ خدا میں دیدیا۔

سائلوں کو ایک دفعہ میں ہزاروں روپے دے دیئے ہیں اور حقیقت میں معاویہ کے ساتھ شرائط صلح میں جو بہت سے مورخین کے بیان کے مطابق ایک خاص رقم کی شرط ملتی ہے کہ معاویہ کی جانب سے ہر سال امام حسن علیہ السلام کے پاس روانہ کی جائے وہ اگر صحیح ہو تو اس کا مقصد صرف یہی تھا کہ اس ذریعہ سے مسلمانوں کے بیت المال کا کچھ روپیہ مستحقین تک بھی پہنچ سکے۔ ہرگز اپنی ذات پر صرف کرنے کے لئے آپ نے اس رقم کی شرط قرار نہیں دی تھی۔ چنانچہ جو کچھ پاس موجود ہوتا تھا چاہے زیادہ سے زیادہ رقم کیوں نہ ہو آپ فوراً سائلوں کو عطا فرما دیتے تھے۔ کسی نے آپ سے پوچھا کہ ''باوجودیکہ آپ خود ضرورتمند ہیں پھر بھی کیا بات ہے کہ سائل کو رد نہیں فرماتے۔'' آپ نے فرمایا ''میں خود خدا کی بارگاہ کا سائل ہوں مجھے شرم آتی ہے کہ خود سائل ہوتے ہوئے دوسرے سائلوں کے سوال کو رد کروں اس صورت میں مجھے کیا حق ہوگا کہ میں اپنے خدا سے اپنے سوال کے پورا ہونے کی تمنا رکھوں۔''

اس کے ساتھ آپ کے علمی کمالات بھی وہ تھے جن کے سامنے دنیا سرخم کرتی تھی ۔ اگر چہ عبداللہ بن عباس امیر المومنینؑ سے حاصل کیے ہوئے علوم سے دنیائے علم میں اپنا ڈنکا بجا رہے تھے مگر جب امام حسنؑ کے خداداد علم کا سامنا ہوجاتا تھا تو خاندان رسالت کی بزرگی کا دنیا کو اقرار کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ ایک سائل نے مسجد نبوی میں آکر ایک آیت کی تفسیر ابن عباس سے پوچھی، عبداللہ ابن عمر سے بھی پوچھی اور پھر امام حسنؑ سے دریافت کی اور آخر میں اس نے اقرار کیا کہ امام حسن علیہ السلام کا جواب یقینا ان دونوں سے بہتر تھا۔ اکثر آپ نے اپنے دشمن معاویہ کے دربار اور وہاں کے مخالف ماحول میں فضائل اہل بیتؑ اور مناقب امیر المومنینؑ پر ایسی موثر تقریریں فرمائیں ہیں کہ دشمنوں کے سر جھک گئے اور آپ کی فصاحت وبلاغت اور حقانیت کا ان کے دلوں پر سکہ قائم ہوگیا۔

عبادت بھی آپ کی امتیازی حیثیت رکھتی تھی، بیس یا پچیس حج پاپیادہ کئے جب موت، قبر، قیامت اور صراط کو یاد فرماتے تھے تو رونے لگتے تھے، جب بارگاہ الٰہی میں اعمال کے پیش ہونے کا خیال آتا تھا تو ایک نعرہ مار کر بیہوش ہوجاتے تھے اور جب نماز کو کھڑے ہوتے تھے تو جسم لرزنے لگتا تھا۔

وفات:۔ اس بےضرر اور خاموش زندگی کے باوجود بھی امام حسن علیہ السلام کے خلاف وہ خاموش حربہ استعمال کیا گیا جو سلطنت بنی امیہ میں اکثر صرف کیا جارہا تھا، امیر شام نے اشعث ابن قیس کی بیٹی جعدہ کے ساتھ جو حضرت امام حسن علیہ السلام کی زوجیت میں تھی ساز باز کر کے ایک لاکھ درہم انعام اور اپنے فرزند یزید کے ساتھ شادی کا وعدہ کیا اور اس کے ذریعہ سے حضرت کو زہر دلوایا، امام حسنؑ کے کلیجے کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے اور حالت خراب ہوئی۔ آپ نے اپنے بھائی حضرت امام حسینؑ کو پاس بلایا اور وصیت کی کہ اگر ممکن ہو تو مجھے جد بزرگوار رسولؐ خدا کے جوار میں دفن کرنا لیکن اگر مزاحمت ہو تو ایک قطرہ خون گرنے نہ پائے میرے جنازے کو واپس لے آنا اور جنت البقیع میں دفن کرنا۔ ۲۸/صفر ۵۰ھ کو امام حسنؑ دنیا سے رخصت ہوگئے حسینؑ حسب وصیت بھائی کا جنازہ روضۂ رسولؐ کی طرف لے گئے مگر جیسا کہ امام حسنؑ کو اندیشہ تھا وہی ہوا۔ ام المومنین عائشہ اور مروان وغیرہ نے مخالفت کی نوبت یہ پہنچی کہ مخالف جماعت نے تیروں کی بارش کردی اور کچھ تیز جنازۂ امام حسنؑ تک پہنچے بنی ہاشم کے اشتعال کی کوئی انتہا نہ تھی مگر امام حسین علیہ السلام نے بھائی کی وصیت پر عمل کیا اور امام حسن علیہ السلام کا تابوت واپس لاکر جنت البقیع میں دفن کردیا۔

اقوال امام حسن علیہ السلام:

* گناہوں سے بچو کیونکہ گناہ انسان کو نیکیوں سے محروم کردیتا ہے۔
* تیز چلنے سے مومن کا وقار کم ہوتا ہے اور بازار میں چلتے ہوئے کھانا پستی کی علامت ہے۔
* بری عادتیں جاہلوں کی معاشرت میں اور نیک خصائل عقلمندوں کی صحبت سے ملتے ہیں۔
* ذلیل ہوجانا آتش جہنم سے زیادہ آسان ہے۔
* جسمانی طور پر دنیا میں زندگی بسر کرو اور قلبی طور پر آخرت کی طرف مائل رہو۔

امام جعفر صادق علیہ السلام اور سیاسی جدوجہد

آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای مدظلہ العالی
ترجمہ: مولانا سید ولی الحسن رضوی صاحب

۱۱۴ھ میں امام محمد باقر علیہ السلام کی شہادت کے بعد صادق اہلبیت طہارت امام جعفر صادقؑ مسند امامت پر متمکن ہوتے ہیں اور ۱۴۸ھ تک (تا حیات) اس سیاسی جدوجہد کو جاری رکھتے ہیں البتہ وقت اور حالات کے اعتبار سے آپ کے دور کو دو مرحلوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

پہلا مرحلہ: ۱۱۴ھ تا ۱۳۲ھ یا ۱۳۵ھ یعنی تا غلبۂ بنی عباس یا تا خلافت منصور دوانقی

دوسرا مرحلہ: ۱۳۵ھ تا ۱۴۸ھ یعنی تا آخر لمحۂ حیات

پہلا دور نسبتاً اطمینان وسکون کا دور کہا جاسکتا ہے دراصل یہی وہ دور ہے جس کے بارہ میں مشہور ہے کہ بنوامیہ اور بنو عباس کے درمیان نزاع وچپقلش کی وجہ سے ائمہ علیہم السلام کو اس بات کا موقع ہاتھ آگیا کہ وہ معارف تشیع کھل کر بیان کرسکیں اور یہ اسی دور سے مخصوص ہے کیونکہ امام محمد باقر علیہ السلام کے دور میں یہ صورت پیدا نہیں ہوسکتی تھی۔ اسوقت بنوامیہ پورے اقتدار میں تھے اور ہشام بن عبدالملک کی حکومت تھی جسکے بارے میں لوگ کہتے ہیں ''وکان ہشام رجلهم'' چنانچہ شاہان بنوامیہ میں عبدالملک بن مروان کے بعد طاقتورترین شخصیت ہشام بن عبدالملک کی ہی گزری ہے لھذا امام محمد باقر علیہ السلام کے زمانہ میں کسی کا کسی کے ساتھ کوئی ایسا اختلاف و تنازعہ بظاہر رونما نہیں ہوا کہ اس کا ائمہ علیہم السلام فائدہ اٹھا کر اپنی سیاسی سرگرمی کو تیز تر کرسکتے تمام داخلی جنگیں اور سیاسی اختلافات امام جعفر صادق علیہ السلام کے دور سے مخصوص ہیں اور وہ بھی اس ابتدائی دور سے جب آہستہ آہستہ بنوعباس کی سرگرمی تیز تر ہوتی ہے اور ان کی دعوت میں پھیلاؤ پیدا ہونا شروع ہوتا ہے اور دوسری طرف علوی شیعوں کی دعوت بھی پوری اسلامی دنیا میں اس اوج پر نظر آتی ہے کہ فی الحال اس کی تشریح کا موقع نہیں ہے۔

جس وقت امام صادق علیہ السلام مسند امامت پر متمکن ہوتے ہیں پوری اسلامی دنیا ــــ افریقہ، خراسان، فارس، ماوراء النہر ــــ غرض یہ کہ مختلف اسلامی علاقوں میں جنگ اور مقابلہ آرائی کا بازار گرم تھا بنوامیہ کی حکومت شدید مشکلات سے دوچار تھی امام علیہ السلام نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور اپنی تبلیغ کے لئے وہی تین نقطے محور ومرکز قرار دیئے یعنی معارف اسلامی، مسئلہ امامت نیز اس کا اہلبیت علیہم السلام سے مخصوص ہونا، خصوصاً یہ تیسرا عنصر پہلی مرتبہ اس دور میں امام صادقؑ کی زبان سے بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ جس کا ایک نمونہ عمرو بن ابی المقدام کی یہ روایت ہے جس میں وہ کہتے ہیں: **رأیت ابا عبداللہ یوم عرفه بالموقف وهو ینادی باعلیٰ صوته** ــــ حضرت عرفات میں لوگوں کے

درمیان کھڑے ہوکر عظیم اجتماع سے باآواز بلند خطاب فرماتے ہیں اور ایک ہی جملہ کبھی اس طرف رخ کرکے اور کبھی اس طرف رخ کرکے ہر چہار طرف تین تین مرتبہ تکرار فرماتے ہیں اور وہ جملہ یہ تھا۔

ایھا الناس! ان رسول اللّٰہ کان ھو الامام (اس میں کلمۂ امام کا استعمال قابل توجہ ہے اور یہ اس حقیقت کی طرف نشان دہی کرتا ہے کہ امامؑ اس طرح عوام کے ذہن کو امامت کی حقیقت سے روشناس کرتے ہوئے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ آیا وہ لوگ جو برسر اقتدار ہیں امامت کے سزاوار ہیں یا نہیں؟) **ثم کان علی ابن ابی طالب ثم الحسن ثم الحسین ثم علی ابن الحسین ثم محمد ابن علی ثم ھاہ فینادی ثلاث مرات لمن بین یدیہ و لمن خلفہ و عن یمینہ و عن یسارہ اثناعشر ۃ صوتا''**

یعنی اے لوگو! یقیناً امام رسولؐ خدا تھے پھر آپ کے بعد علی ابن ابی طالبؑ اور پھر حسنؑ اور پھر حسینؑ پھر علیؑ ابن الحسینؑ پھر محمد بن علیؑ اور اس کے بعد ''ھاہ'' (یعنی میں)......مجموعاً بارہ مرتبہ آپ نے ان جملوں کی تکرار فرمائی۔ راوی کہتا ہے میں نے سوال کیا کہ اس 'ھاہ' سے کیا مراد ہے؟ کہتے ہیں: بنی فلاں کی لغت میں، یعنی میں، اس سے کنایہ خود حضرت کی طرف ہے یعنی محمد بن علی علیہ السلام کے بعد میں امام ہوں۔

دوسرا نمونہ:

قال قدم رجل من اھل الکوفہ الیٰ خراسان فدعا الناس الیٰ ولایۃ جعفر بن محمد ـــــ ایک شخص مدینہ سے خراسان پہونچتا ہے اور لوگوں کو امام جعفر ابن محمد کی ولایت یعنی حکومت کی طرف دعوت دیتا ہے۔

آپ ایران میں اسلامی انقلاب کی تحریک کا مطالعہ فرمائیں وہ وقت جبکہ ہم کھل کر جمہوری اسلامی یا حکومت اسلامی کی بات کرسکیں کب پیدا ہوا؟ ہم لوگ اس پوری تحریک اور جد وجہد کے دوران برسوں تک زیادہ سے زیادہ حکومت کے سلسلہ میں اسلامی نظریات کی گفتگو کر پاتے تھے یعنی بہت ہوا تو یہ کہہ پائے کہ حکومت کے بارے میں اسلام نے کیا اصول وضوابط پیش کئے ہیں اور حاکم کو کن شرائط کا حامل ہونا چاہیے۔ بس اس سے زیادہ ہم اور کچھ نہیں کہہ سکتے تھے حکومت اسلامی کی تشکیل کی دعوت دینے یا کسی خاص شخص کا حاکم کے طور پر نام لینے کی نوبت نہیں آسکی تھی۔ ۱۹۷۸ء یا زیادہ سے زیادہ ۱۹۷۷ء میں اور وہ بھی خاص محفلوں میں ہمارے لئے ممکن ہوسکا تھا کہ اپنی جد وجہد کو حکومت اسلامی کی دعوت کے ساتھ مشخص کر سکیں اور اس وقت بھی کسی کو اس کے حاکم کے طور پر معین نہیں کر سکے تھے ـــــ ان حقائق کی روشنی میں آپ ملاحظہ فرمائیں کہ لوگ مملکت اسلامی کے دور دراز علاقوں میں امام صادق علیہ السلام کی حکومت کی طرف عوام کو دعوت دیتے ہیں، اس کے معنی کیا ہیں؟ کیا اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اب وہ وعدہ پورا ہونے کا وقت قریب آچکا ہے؟ یہ وہی ۱۴۰ھ کا سال ہے، یہ وہی چیز ہے جو ائمہ علیہم السلام کی مسلسل جد وجہد کا فطری تقاضہ ہے اور حکومت اسلامی کی تشکیل کی خوش آیند ساعت کی نشان دہی کرتی ہے۔

لوگوں کو امام جعفر ابن محمدؑ کی ولایت وحکومت کی طرف دعوت دی جاتی ہے۔ آج ہم ولایت کا مفہوم اچھی طرح سمجھتے ہیں، پہلے ولایت کا مطلب محبت کرنا بتایا جاتا تھا لوگوں کو امام صادقؑ کی ولایت یعنی محبت کی طرف دعوت دینا؟ اس میں دعوت دینے کا کیا مطلب ہے؟ محبت کوئی ایسی کوئی چیز تو نہیں ہے کہ جس کی معاشرہ کو دعوت دی جائے! اس کے علاوہ اگر ولایت کا مفہوم محبت لیا جائے تو

حدیث کے بعد کے فقرے بے معنی ہوجاتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے: ففرقه اطاعت و اجابت ایک فرقہ نے اطاعت وقبولیت کا ثبوت دیا۔ و فرقة جهدت و انكرت اورایک فرقہ نے انکار کیا اور قبول نہ کیا (اسلامی دنیا میں محبت اہلبیتؑ سے کون لوگ انکار کرتے تھے؟!!) و فرقة ورعت و وقفت اور ایک فرقہ نے ورع اختیار کرتے ہوئے خاموشی سادھ لی۔ تورع اور توقف کا بھی کسی طرح محبت اہلبیتؑ کے ساتھ کوئی ربط سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ خود اس بات کا قرینہ ہیں کہ ولایت سے مقصود کچھ اور ہے، ظاہر ہے وہ حکومت ہی ہوسکتی ہے۔ حدیث کے آخری فقرے کچھ اس طرح ہیں: فخرجت من كل فرقة رجل فدخلوا علىٰ ابى عبدالله ہر طرف سے لوگ امام کی خدمت میں آتے ہیں اور گفتگو کرتے ہیں۔ حضرتؑ ان میں سے ایک سے جس نے خاموشی اختیار کی تھی فرماتے ہیں: تم نے اس سلسلہ میں جو توقف و تورع اختیار کیا اس وقت یہ تورع کیوں نہ اپنایا جب فلاں نہر کے کنارے فلاں روز فلاں مخالف اسلام کا کام انجام دے رہے تھے؟! یہ ارشاد بخوبی اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ وہ شخص جس نے خراسان میں امامؑ کی ولایت کی طرف دعوت کا فریضہ انجام دیا تھا امام کی رضا کے بعد یہ کام انجام دیا تھا بلکہ ممکن ہے کہ خود امام علیہ السلام نے ہی اس کو اس بات پر مامور کیا ہو۔

یہ گفتگو امام صادق علیہ السلام کی زندگی کے پہلے مرحلہ سے تعلق رکھتی تھی اور آپ کی زندگی میں ایسے نشانات ملتے ہیں کہ غالباً اس طرح کی تمام چیزیں اسی پہلے دور سے مربوط ہیں یہاں تک کہ منصور عباسی کی خلافت کا دور شروع ہوجاتا ہے منصور کے برسر اقتدار آتے ہی پھر مشکلات کا دور شروع ہوجاتا ہے اور تقریباً امام کے لیئے وہی حالات پیدا ہوجاتے ہیں جن سے امام محمد باقر علیہ السلام کی زندگی دوچار تھی طرح طرح کے دباؤ آپ پر پڑنے لگتے ہیں۔ حضرتؑ کو بارہا حیرہ، واسطہ، رمیلہ نیز دوسری جگہوں پر طلبی اور جلاوطنی کی منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے، کئی مرتبہ حضرت کو خلیفہ کی طرف سے سخت لب ولہجہ میں مورد خطاب اور غم وغصہ کا نشانہ بننا پڑتا ہے۔ ایک دفعہ خلیفہ یہاں تک کہتا ہے کہ قتلنى الله ان لم اقتلک خدا مجھے زندہ نہ رکھے اگر میں آپ کو قتل نہ کروں، ایک دفعہ حاکم مدینہ کو حکم دیتا ہے کہ: ''ان احرق علىٰ جعفر بن محمد داره'' (یعنی حضرت کے ساتھ آپ کے گھر میں آگ لگادو) حضرت جلتی ہوئی آگ کو عبور کرتے ہیں اور بڑے ہی توکل واعتماد کے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے دلوں کو چھید دینے والے لب ولہجہ میں یہ الفاظ بیان فرماتے ہیں: ''انا ابن اعراق الثرىٰ انا ابن محمد المصطفیٰؐ''

جس نے دشمنوں کو بھی اور ذلیل وخوار کیا ——— ایسا لگتا ہے کہ امام صادق علیہ السلام اور منصور کے تعلقات نہایت کشیدہ رہے ہیں چنانچہ منصور نے بارہا امامؑ کو دھمکیاں بھی دی ہیں۔ اگرچہ اس طرح کی روایات بھی ملتی ہیں جن میں امام کو منصور کے سامنے اپنی حقارت و عاجزی (معاذاللہ) کا اظہار کرتے ہوئے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے!! اور یقینی طور پر ان میں سے ایک روایت بھی درست وقابل اعتماد نہیں ہے، میں نے ان روایات کا جائزہ لیا اور تحقیق کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا کہ ان کی کوئی اصل وحقیقت نہیں ہے۔ ان کا سلسلہ زیادہ تر ربیع حاجب تک پہونچتا ہے جس کا فاسق ہونا قطعی ویقینی ہے اور وہ منصور کے قریبی لوگوں میں سے ہے تعجب ہوتا ہے کہ بعض لوگ کہتے ہیں ''ربیع شیعہ اور دوستدار اہلبیتؑ تھا''! ربیع کہاں اور شیعہ ہونا کہاں؟ ربیع ابن یونس منصور کا مطیع وفرمانبردار اور حکم کا غلام ہے اور ان افراد سے ہے جو بچپن سے بنی عباس کے نوکروں میں سے تھے اور

بقیہ صفحہ ۲۵ پر

علی علیہ السلام بحیثیت حاکم

حکیم الامت علامۂ ہندی مولانا سید احمد نقوی مجتہد طاب ثراہ

جمہوریت، ڈکٹیٹری، وفاقی، خودمختاری، نظام فسطائی، کمیونزم، نازیت ـــــ کوئی نظام حکومت کامیاب نہیں ہوسکتا۔ (دیکھو ہماری کتاب کمیونزم و اسلام، اسلام دین فطرت) جب تک اس کی بنیادیں خالص محبت عقلائی پر قائم نہ ہو جو اساس ایثار و قربانی و عدالت کا ہے ورنہ ملک میں امن و امان مفقود ہوگا۔ فتنہ و فساد کا بازار گرم رہے گا۔ شورش اور انقلابات سے ملک میں ہر آن ہیجان رہے گا، تجربات شاہد ہیں۔

بہ نسبت افراد کے برسراقتدار جماعت (اگر پارلیمنٹری حکومت ہے) اور ڈکٹیٹری اور شخصی حکومت ہے تو حاکم و ڈکٹیٹر کے لئے روح کی پاکیزگی، جذبات کی لطافت، احساس ہونا لازمی ہے۔ علی مجسمۂ محبت ہیں اس لئے ان کی حکومت اور تمدنی زندگی کو اجمالاً سنو۔

بیوہ و یتیم!

وہ حاکم کوفہ و مدینہ شبہائے تار میں تنگ و تاریک گلیوں میں پھر کر بیواؤں، یتیموں، مصیبت زدوں کو تلاش کرتا پھرتا ہے۔ کاندھے پر زنبیل میں روٹی خرما لادے گھر پہنچاتا ہے۔ بوڑھی، بیوہ کی مشک کاندھے پر لاد کر گھر پہونچاتا ہے اور تنور روشن کرتا جاتا اور افسوس کرتا ہے کہ بہت دیر میں بیوہ کی خبر گیری کی۔

مریضوں کا خیال

رسول زادی نے حسب الحکم رسول کبھی کوئی فرمائش شوہر سے نہ کی تھی۔ اب حالت مرض میں خود علی کے اصرار سے انار کی فرمائش کی، بے فصل انار کا ملنا ہی دشوار تھا، بدقت ایک انار دستیاب ہوا، بازار سے لیکر چلے۔ راستہ میں ایک مریض کی ایک گڑھے سے کراہنے کی آواز سنی، بے چین ہو کر گڑھے کی طرف متوجہ ہوئے۔ ایک بیمار و علیل کو دیکھا، سر اس کا اپنے زانو پر رکھا نہایت محبت سے پوچھا ''کسی چیز کے کھانے کو دل چاہتا ہے؟'' مریض نے انار کی فرمائش کی۔ اب علیؑ کو کب تاب تھی! انار چھیل چھیل کر اپنے ہاتھ سے دانے مریض کے منہ میں دئے اور خالی ہاتھ گھر واپس آئے۔

دوستوں کا خیال

بچے بھوک سے تڑپ رہے ہیں، کئی دن کا فاقہ ہے، کچھ پیسہ فراہم ہوتا ہے، بازار سے غلہ لینے جاتے ہیں۔ راہ میں جناب مقداد کو بھوکا فاقے سے بے حال دیکھ کر بیتاب ہوجاتے ہیں اور پیسہ مقداد کے حوالے کردیتے ہیں۔

جناب ابوذر خلیفہ عثمان کے حکم سے شہر بدر کئے جاتے ہیں اہل مدینہ کو حکم دیا جاتا ہے کہ کوئی ابوذر کو رخصت نہ کرے۔ علیؑ اپنے دونوں فرزندوں کو لے کر رسولؐ کے اس جلیل القدر بوڑھے صحابی کو بے باکانہ روتے ہوئے وداع کرتے ہیں اور وزیر اعظم مروان کے حکم خلافتی سنانے کے باوجود پرواہ نہیں کرتے۔

دشمنوں کا خیال

خلافتوں کی ستم آرائیاں تاویلوں کے پردے میں پوشیدہ نہیں رہ سکتیں۔ لیکن ہر آڑے وقت میں ہر ایک کے علی کام آئے خلیفہ عثمان کو کوفے اور بصرے والوں نے جب گھیرا، علی ہی تھے

جنھوں نے خلیفہ کو مواعظ و نصیحت فرمائی اور نیک مشورے دئے۔ اور بشری کمزوری جو ہر انسان کو دشمن کے ساتھ حسن سلوک سے مانع ہوتی ہیں، کبھی علی نے خیال نہ فرمایا۔ کسی بہادر و قوی پہلوان کو زیر کر کے قتل کر دینا اتنا اہم نہیں ہے، جتنا ایک جنگجو زبردست دشمن کے سینہ پر بیٹھ کر اس کے گستاخانہ لعاب دہن کو پھینکنے کے بعد سینہ سے ہٹ جانا۔ اور دوبارہ اس کو مغلوب کر کے قتل کرنا ہے۔ دشمنوں کو قتل کے بعد ان کے دست و پاک نہ کاٹنا اور منع کرنا، اسی طرح بھاگتے ہوؤں کا پیچھا نہ کرنا، عورتوں، بچوں سے مزاحمت نہ کرنا، دشمنوں کی زراعت کو تباہ و برباد نہ کرنا، کنوؤں میں زہر ملانے کی ممانعت فرمانا۔ یہ ہے علیؑ کی پاکیزہ دلی اور دشمنوں سے محبت!!

قاتل کا خیال

علی منافقوں اور خارجیوں کی تمام ریشہ دوانیوں سے خبردار تھے۔ ابن ملجم قاتل کو خود خبر دیتے اور فرماتے کہ تو میرا قاتل ہے۔ لوگ عرض کرتے ہیں کہ ہم کو حکم ہو اس کو قتل کر دیں۔ جواب میں فرماتے ہیں کہ قبل ارتکاب جرم سزا کیسی۔ مجروح ہونے کے بعد اسی قاتل پر یہ مہربانی کہ ویسا ہی کاسئہ شیر پلوائیں جیسا کہ خود پیا تھا۔ وصیت میں فرمادیں ''اے حسن میں زندہ رہا تو اختیار ہے کہ اس کو بخش دوں یا سزا دوں لیکن اگر مر گیا تو خبردار ایک ضربت سے زیادہ ضربت نہ لگانا، اس کے دست و پا، کان و ناک ہرگز نہ کاٹنا اور عفو کر دو تو بہتر ہے۔''

اللہ اللہ جرم و سزا کو برابر سمجھنا بالخصوص اس وقت جبکہ خود اپنے اوپر ظلم ہوا ہو اور مظلوم کے قبضہ میں ظالم ہو۔!! کیا تاریخ اس کی نظیر پیش کرتی ہے؟

علیؑ کا خزانہ

بیت المال میں جو جمع ہوتا تھا، علی مساویانہ طور پر تقسیم کر دیتے اور بیت المال میں اپنے ہاتھ سے جھاڑو دیتے اور دو رکعت نماز پڑھتے۔ ایک روز مال غنیمت میں ایک روٹی آئی، آپ نے اس کے بھی ٹکڑے کر کے تقسیم کر دئے۔

شب کے وقت بیت المال کا حساب کر رہے تھے عمرو عاص نے آپ سے بات کرنا چاہی۔ علیؑ نے چراغ گل کر دیا کہ یہ بیت المال کا تیل ہے لہٰذا نہ صرف ہو۔

آپ کے بھائی عقیل نے بیت المال سے قبل تقسیم اپنا حصہ طلب کیا اور نہایت محتاجی کا شکوہ کیا اور اصرار کیا کہ قبل تقسیم و خیرات عقیل کا حصہ دیدیں۔ علیؑ نے ایک شخص کو حکم دیا کہ عقیل کا ہاتھ تھام کر بازار لے جاؤ اور دوکانوں کے قفل توڑ ڈالو تا کہ عقیل دوکانوں کا مال لوٹ لیں۔ عقیل نے عرض کی آپ مجھ کو چوری کرنا سکھاتے ہیں۔ جناب امیرؑ نے جواب دیا ''اے عقیل تم مجھ کو چوری کرنا سکھاتے ہو تا کہ میں مسلمانوں کا مال تم کو دیدوں۔'' عقیل خفا ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے اور کہا کہ میں معاویہ کے پاس چلا جاؤں گا۔ آپ نے فرمایا تمہیں اختیار ہے۔

حقوق رعایا کی نگرانی

ابی مطر مصری ناقل ہیں کہ کسی کی کنیز نے ایک دوکاندار سے ایک درہم کی کھجور خریدی۔ مالک نے ناپسند کی اور دام واپس لانے کو کہا، دوکاندار نے واپسی سے انکار کیا، کنیز بازار میں مالک کے خوف سے کھڑی رو رہی تھی، جناب امیر نے دوکاندار سے سفارش کی ''کنیز مجبور ہے کھجوریں واپس لے لے'' کھجور والے نے علیؑ کو نہ پہچانا اور دھکا دیا ـــــ علی خاموش ہٹ گئے۔ جب کھجور والے کو معلوم ہوا کہ یہ امیر المومنین تھے، معذرت کرنے لگا اور عرض کی کہ آپ مجھ سے راضی ہو جائیے۔ فرمایا ''میری رضا اسی میں ہے کہ تو لوگوں کے حق

کا خیال رکھ!''

بازار کوفہ میں گشت کرتے ، گم کردہ راہ کو راستہ بتاتے ، بوجھ اٹھواتے اور اپنے گھر والوں کے لئے ایک درہم کے خرمے خرید فرما کر پشت پر لاد کر گھر لاتے ۔ ابو صالح کے دادا نے چاہا کہ خود بوجھ لے لیں ۔ فرمایا ''بچوں کا باپ بھی ان کھجوروں کے اٹھانے کا حقدار ہے۔''

درزی کی دوکان پر جاتے اور فرماتے ''کپڑا مضبوط سیا کرو اور کترن وچھٹن مالک کو واپس کیا کرو'' قصاب کو حکم ہوتا کہ کلیجی میں ہوا بھر ہو خریدار کو دھوکا نہ دیا کرو، مچھلی والوں کو حکم ہوتا کہ حرام مچھلی نہ بیچا کرو۔

عاملوں کو ہدایت

مالک اشتر کو ایک بہت طولانی خط جناب امیر نے لکھا ہے جس میں جہانداری و جہانبانی پر مفصل بحث فرمائی ہے اور حکومت کرنے کے قواعد و اصول وضوابط بتائے ہیں ۔ اسی خط میں آپ فرماتے ہیں ''تم کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ والی وحاکم کے بعض رشتہ دار مخصوص ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی یہ عادت ہوتی ہے کہ اپنے نفس کو دوسروں پر مقدم کریں، لوگوں کے اموال پر دست درازی کریں اور ناانصافی کریں۔ضرورت ہے کہ ان کی خواہشات کے اسباب کو قطع کر دیا جائے۔ اپنے عزیزوں کے لئے جاگیر مقرر نہ کرو اور کسی ایسی زمین کے مل جانے کی طمع نہ دلاؤ جس سے قرب و جوار میں بسنے والوں کو سیرابی زمین یا کسی مشترک کام میں ضرر پہونچتا ہو۔ ایسے لوگ خود تو خوشگوار نفع اٹھائیں گے اور تم دنیا و آخرت میں عذاب میں گرفتار رہو گے۔تم کو سب سے زیادہ یہ بات محبوب ہونی چاہیئے جو سب سے زیادہ حق سے قریب ہو اور عدل کے لحاظ سے سب سے زیادہ عام اور تمام رعایا کی رضامندی کا باعث ہو کیونکہ عوام کی ناراضی خواص کی رضامندی کو بے تاثیر بنا دیتی ہے اور اگر عوام راضی ہیں تو خواص کی رضامندی قابل التفات نہیں ہوتی ۔ تمام رعایا میں خواص ہی وہ گروہ ہے جو ذیل کی بری خصلتوں کا حامل ہوتا ہے:

۱۔فراخ حالی میں حاکم کے لیئے بارخاطر ہوتے ہیں

۲۔ بلاومصیبت میں کم مدد دیتے ہیں

۳۔انصاف سے پہلو تہی کرتے ہیں

۴۔اپنی خواہشوں کے منوانے پر اصرار ہوتا ہے

۵۔عطا یا ملنے پر بہت کم شکرگذاری کرتے ہیں

۶۔اگر ان کو کچھ نہ دیا جائے تو عذر ومعذرت سننے پر سستی کرتے ہیں اور

۷۔زمانے کے حوادث پر صبر کرنے میں نہایت کمزور ہوتے ہیں۔

یہ فقط عوام الناس ہی ہیں جو دین کا ستون بنتے ہیں ۔ مسلمانوں کا نظام ان سے درست رہتا ہے اور دشمنوں کے مقابلہ میں تیار فوج کا کام کرتے ہیں ۔ اس صورت میں تم کو صرف عامۃ الناس ہی کی حالت سدھارنا اور انہیں کی طرف لگے رہنا چاہیئے ۔''

یہ نچوڑ ہے سیاست علوی ومعاشرت تمدنی کا جس کو مارکسؔ ولینن، انجلیزؔ واسٹالنؔ نے غلط طور پر سمجھا اور دنیا کو ناامنی کے گڑھے میں ڈھکیل دیا۔ یہ تعلیم لیبر تحریک کی جان ہے اور دیہات سدھار کی صحیح راہنمائی ہے۔

ملکی آمدنی

اپنے شاگرد ابن عباس کو تحریر فرماتے ہیں:

''مجھکو تمہاری نسبت خبر ملی ہے کہ اگر سچ ہے تو تم نے

خدا کو اپنے سے ناراض کرلیا ہے۔ اپنے امام کی نافرمانی کی، امانت میں خیانت کی، زمین کو خراب کیا، جو کچھ تمہارے زیر قدم تھا وہ لے لیا، جو تمہارے ہاتھوں میں تھا وہ کھا گئے لہٰذا اپنا حساب میرے سامنے پیش کرو اور جان لو کہ خدا کا محاسبہ انسان کے محاسبہ سے عظیم تر ہے۔''

دوسرے خط میں ابن عباس کو تحریر فرماتے ہیں:

''میں نے تم کو اپنا شریک امانت بنایا تھا اور اپنے خاص لوگوں میں تم کو شامل کیا تھا۔ جب تم نے یہ دیکھا کہ تمہارے بھائی (علی) پر زمانہ سخت آ گیا، دشمن برسرپیکار ہے اور قوم بیباک اور خیر سے دور ہے، تم نے بھی ڈھال کا رخ پلٹ دیا۔ جب امت کے مال میں خیانت کی تم کو قدرت مل گئی تو تم نے جلدی سے حملہ کر دیا اور تیزی سے دوڑ پڑے اور جہاں تک تم سے ہو سکا بیواؤں اور یتیموں کے اموال تم لے بھاگے جس طرح تیز اور چالاک بھیڑیا زخمی کمزور بکریوں کو اچک لے جاتا ہے۔ تم خوش خوش اس مال کو حجاز لے بھاگے اور اس دست برد سے تم کو گنہگار ہونے کا خیال نہ ہوا ہو گویا یہ تمہارے ماں باپ کی میراث تھی۔ کیا تم کو روز قیامت پر بالکل اعتقاد نہیں ہے۔ اور اس دن کے حساب و کتاب کا تم کو بالکل خیال نہیں ہے بخدا اگر حسنؑ و حسینؑ بھی ایسا کام کرتے جو تم نے کیا ہے تو ان کے لئے میرے نزدیک نرمی کرنے کی گنجائش نہ تھی میں ضرور ان سے وہ حق لے کر رہتا اور باطل کو مٹاتا۔''

علیؑ کی نظر میں سرمایہ دار

جناب امیرؑ بصرہ کے گورنر عثمان بن حنیف کو ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں: ''اے ابن حنیف مجھکو خبر ملی ہے کہ بصرہ کے نوجوانوں میں سے کسی شخص نے تم کو دعوت دی۔ تم وہاں بڑے شوق سے گئے، طرح طرح کے نفیس کھانے کھائے مجھکو یہ خیال بھی نہ تھا کہ تم اس قوم کی دعوت قبول کرو گے جو مسکینوں، غریبوں سے تو بھاگے اور امیروں کو دعوتیں کھلا دے۔ تم کو آئندہ لازم ہے کہ جو کچھ کھاؤ اس پر نظر رکھو جس کے حلال و حرام ہونے میں شبہہ ہو اس کو نکال پھینکو اور جس غذا کے پاک و پاکیزہ ہونے کا یقین ہو وہی کھاؤ۔ دیکھو ہر ماموم کے لئے ایک امام ہوتا ہے جس کی وہ پیروی کرے اور جس کے نور علم سے روشنی حاصل کرے۔ آگاہ ہو تمہارے امام نے مال دنیا میں سے فقط دو پرانی چادریں اور کھانوں سے محض دو روٹیوں پر اکتفا کی ہے۔ یہ سچ ہے کہ تم اس زہر کھانے پر قادر نہیں ہوتا ہم پرہیزگاری، پاکدامنی، راست روی سے میری مدد کرتے رہو خدا کی قسم میں نے تمہاری دنیا میں سے سونا چاندی جمع نہیں کیا اور نہ اس کی غنیمتوں میں سے کچھ اکٹھا کیا ہے۔

اگر میں چاہتا تو میں بھی اس صاف و مصفا شہد اور خالص گیہوں، ریشمی کپڑوں سے فائدہ اٹھا سکتا تھا لیکن یہ کتنے افسوس کی بات ہوتی کہ میرا نفس مجھ پر غالب آ جاتا اور حرص اچھے کھانوں کی طرف کھینچ لے جاتی درآنحالیکہ حجاز و یمامہ میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جن کو ایک روٹی کا بھی سہارا نہیں ہے اور شکم سیری سے وہ آشنا نہیں اور میں پیٹ بھر سو رہوں اور بھوکے پیٹ اور جلے ہوئے جگر میرے گرد جمع و موجود ہوں۔ کیا میں اپنے نفس کے لئے بس اس پر قناعت کرلوں کہ مجھے لوگ امیر المومنین سمجھیں اور میں ان کی تکالیف و شدائد میں ان کا شریک اور سختی و بدحالی میں ان کا پیشوا نہ بنوں۔''

بیشک علی مرتضیٰؑ کے ہاتھوں حدود قصاص بھی جاری ہوئے، مشرکین و کفار کو بھی علی مرتضیٰؑ نے قتل کیا ہے۔ آپ کے فیصلوں میں عدالت و تادیب بھی تھی اور وہ نظام حب کے ساتھ نظام عدل کے لئے نظام محبت پر محض عامل رہے۔ البتہ دوسروں کے معاملات میں عدالت برتتے تھے اور اس عدالت میں بھی جذبۂ محبت غالب ہوتا تھا

بقیہ صفحہ ۴۷ پر

بقیع میں مزارات اہلبیتؑ و اصحابؓ

عماد العلماء علامہ سید محمد رضی طاب ثراہ

مدینۂ طیبہ کے قبرستان کا نام جنت البقیع ہے ''بَقِیع'' کے لغوی معنی اس مقام کے ہیں جہاں مختلف قسم کے درختوں کی جڑیں پائی جاتی ہوں ۔ اس کا نام ''بَقِیعِ غَرْقَدْ'' بھی ہے۔ ''غَرْقَد'' ایک خاص درخت کا نام ہے جسے علامہ یاقوت حموی ''عَوْسَجْ'' کہتے ہیں اور دوسرے اہل تحقیق درخت ''غَضَا'' کی ایک قسم بتاتے ہیں ۔ اسی درخت ''غَرْقَد'' کی مناسبت سے اس مقام کا نام ''بَقِیعِ غَرْقَد'' رکھ دیا گیا۔ غرض یہ وہ جلیل القدر قبرستان ہے جہاں ہزاروں بزرگان دین مدفون ہیں ۔ سیرت نگاروں نے بتایا ہے کہ اس میں تقریباً دس ہزار صحابۂ کرامؓ کی قبور ہیں ۔ اس قبرستان کا طول ایک سو پچاس میٹر اور چوڑائی ایک سو میٹر ہے ۔ حضورؐ انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاص طور پر اس قبرستان میں تشریف لا کر یہاں کے اہل قبور پر سلام فرماتے تھ ۔ اس قبرستان میں جو اصحاب کرامؓ مدفون ہیں ان میں سے اکثر و بیشتر کے نام معلوم نہ ہو سکے ۔ جن بزرگوں کے مزارات کا علم ہو سکا ہے ان کے دس مشاہد ہیں ۔ ان دس میں سے ایک مشہد حضرت عباسؓ بن عبد المطلبؓ عم سرور کائناتؐ کا ہے ۔ اسی مشہد میں قول مشہور کی بناء پر حضرت فاطمہ زہرا صلوات اللہ علیہا کی قبر مبارک ہے ۔ اور حضرت امام حسنؑ، حضرت امام زین العابدینؑ، حضرت امام محمد باقرؑ اور حضرت امام جعفر صادق علیہم السلام کی قبور مطہرہ بھی اسی میں ہیں ۔ ایک مشہد امہات المومنین جس میں حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ اور حضرت میمونہؓ کے علاوہ تمام دیگر ازواج مطہرات سرور کائناتؐ کی قبور ہیں ۔ حضرت خدیجہ کی قبر مکہ کے قبرستان ''معلاۃ'' میں ہے اور حضرت میمونہ کی قبر مکہ سے قریب چند میل کے فاصلہ پر مقام ''سَرِف'' میں ہے ۔ ان دس مشاہد میں سے ایک مشہد حضرت عثمانؓ بن عفان کا ہے جو بقیع کے شرقی حصہ میں ہے ۔ ایک مشہد حضرت سرور کائناتؐ کے فرزند حضرت ابراہیم کا ہے جس میں سات صحابہ کرامؓ مدفون ہیں ۔ اسی مشہد میں بعض کے نزدیک حضرت فاطمہ بنت اسد والدہ حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کی قبر بھی ہے ۔ ایک مشہد حضرت عقیل بن ابی طالب کا ہے جس میں اولاد حضرت عبد المطلبؓ کی بعض شخصیتیں مدفون ہیں ۔ ان ہی میں حضرت عبد اللہؓ بن جعفر بن ابی طالبؓ بھی ہیں

حضرت عقیلؓ کی قبر کے متعلق راویوں میں اختلاف بھی پایا جاتا ہے کہ وہ بقیع ہی میں ہے یا کسی دوسری جگہ پر ہے ۔ ایک مشہد حضرت فاطمہ بنت اسد کی طرف منسوب ہے اور کچھ لوگوں کے نزدیک آپ یہیں دفن ہیں مگر بعض کہتے ہیں کہ دراصل یہ مشہد ان کا نہیں بلکہ مشہور صحابی رسول حضرت سعدؓ بن مُعاذ کا ہے ۔ ایک مشہد حضرت صفیہؓ بنت عبد المطلب کا ہے جو حضور انور کی پھوپھی تھیں ۔ اکابر فقہاءؒ و علماءؒ کی بھی اس جلیل القدر قبرستان میں قبریں ہیں ۔ امام مالکؒ بھی یہیں مدفون ہیں ۔ اصحاب کرامؓ میں حضرت عثمانؓ بن مظعون، حضرت عبد اللہؓ بن مسعود، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص اور حضرت ابو سعیدؓ خُدری جیسی جلیل ہستیاں بھی یہیں مدفون ہیں ۔ اس قبرستان میں سب سے پیشتر حضرت عثمانؓ بن مظعون مشہور صحابی اور

حضورؐ کے دودھ شریک بھائی دفن ہوئے۔ جن کی وفات غزوۂ بدر کے بعد ہوئی تھی۔ ان کی قبر یہاں سب سے پہلی قبر تھی اس کے بعد دوسری قبر حضورؐ کے فرزند حضرت ابراہیمؑ کی بنی تھی اور پھر بعد میں دوسرے لوگوں کے دفن ہونے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

طبقات ابن سعد اور دوسری کتابوں میں لکھا ہے کہ حضورؐ انور نے اس خطہ زمین کو اپنے اصحابؓ و اہل بیتؑ کے لیئے خود منتخب فرمایا تھا جس کے پہلے مدفون حضرت عثمانؓ بن مظعون ہوئے۔ یہ بڑے عابد وزاہد صحابی تھے اور حضور ان سے بیحد محبت فرماتے تھے ان کی وفات کے بعد آنحضرتؐ نے ان کے چہرے سے چادر ہٹا کر ان کی دونوں آنکھوں کے درمیان بوسہ دیا تھا اور گریہ فرمایا اور فرماتے تھے کہ ابن مظعون ہمارے بہترین سلف ہیں ۔ انسؓ بن مالک کہتے ہیں کہ ان کی زندگی میں ان کے ایک فرزند کا انتقال ہوگیا تھا جس کے غم میں انہوں نے ترک دنیا کا ارادہ کرلیا اور اپنے گھر کے ایک گوشہ میں دن رات عبادت کرنے لگے۔ جب حضورؐ کو خبر ہوئی تو آپ ان کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا (اے ابن مظعون) اللہ نے ہمیں رہبانیت یعنی ترک دنیا کی اجازت نہیں دی ہے۔ ہماری رہبانیت راہ حق میں سعی و کوشش اور جہد و عمل کا نام ہے یعنی یہ کہ ہم مصائب پر صبر و تحمل سے کام لیں اور اپنے فرائض زندگی میں فرق نہ آنے دیں۔

غرض قبرستان بقیع وہ جنت ارضی اور خطۂ نورانی ہے،

ع۔جس کے ہر ذرہ میں پنہاں ہیں ہزاروں آفتاب

بقیہ امام جعفر صادق علیہ السلام اور۔۔۔۔۔۔۔۔

بعد میں منصور کا حاجب ہوگیا اور بے پناہ خدمتوں کے عوض بالآخر منصب وزارت پر فائز ہوگیا جس وقت منصور مرا ہے اگر یہ ربیع نہ ہوتا تو خلافت منصور کے خاندان سے باہر چلی گئی ہوتی اور شاید اس کے چچاؤں کا خلافت پر قبضہ ہوجاتا۔ یہ ربیع ہی تھا جو مرتے وقت منصور کے سرہانے موجود تھا اور اس نے منصور کے بیٹے مہدی کے حق میں جعلی وصیت پیش کردی اور مہدی کو تخت خلافت پر بٹھادیا۔ فضل بن ربیع جو بعد میں ہارون اور امین کے دربار میں وزارت پر فائز ہوا، اسی ربیع کا بیٹا تھا۔ یہ خاندان ان خاندانوں میں سے ہے جو بنی عباس کی نمک خواری و وفاداری میں کافی مشہور ہے ان کے دلوں میں اہلبیت علیہم السلام کے تئیں کسی طرح کی ارادت و محبت نہیں پائی جاتی اور جو کچھ ربیع نے امام صادق علیہ السلام کے سلسلہ میں کہا ہے سراسر جھوٹ اور جعل ہے اور ان تمام کوششوں کے پس پشت اس کا مقصد صرف اتنا تھا کہ موجودہ اسلامی معاشرہ کو یہ باور کرایا جائے کہ حضرت عیسیٰؑ جیسی شخصیت بھی منصور کے سامنے عاجزی اور تذلل کا اظہار کرچکی ہے تاکہ دوسرے افراد اپنی حیثیت کے بارہ میں خود ہی فیصلہ کرلیں۔

منصور اور امام صادق علیہ السلام کے تعلقات انتہائی کشیدہ تھے جو ۱۴۸ھ میں امام کی شہادت پر منتہی ہوتے ہیں۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

* بلاشبہ یہ قرآن ہدایت کا منارہ اور اندھیرے کا چراغ ہے۔ چاہیئے کہ طالب حق آنکھوں کو کھولے اور اس طرح سے چشم و نظر کو نورانی کرے۔ صاحبان بصیرت کے لیئے غور و فکر، حیات افروز ہے بالکل اس طرح جیسے اندھیروں میں روشنی راہ گیر کے لیئے ضروری ہوتی ہے۔

ان الدین عند اللہ الاسلام

آقائے شریعت مولانا سید کلب عابد صاحب قبلہ طاب ثراہ

جو دین خدا کا بھیجا ہوا اور اس کا پسندیدہ دین ہے وہ صرف اسلام ہے پھر دین آدم سے لے کر اس وقت تک دین الٰہی رہا اور یہی دین قیامت تک رہے گا۔ جو نبی یا رسول آیا وہ اسی دین کی تبلیغ کے واسطے آیا اور اسی دین کی حفاظت ہر نبی اور امام کا فریضہ تھا۔ اس دین کے اندر شریعتیں بدلتی رہتی ہیں جن کا تعلق فروع سے ہے کیونکہ دین میں کچھ چیزیں وہ ہیں جن کو اصول اور جڑیں اور بنیادیں کہا جا سکتا ہے اور کچھ چیزیں وہ ہیں جن کو فروع یا شاخیں قرار دیا گیا ہے۔

فروع دین پر نجات اور آخرت کی کامیابیوں کا دارومدار ہے مگر ان فروع میں سے کوئی چیز ہرگز قابل جزا اور سبب ثواب آخرت نہیں ہوتی جب تک اصول درست نہ ہوں۔ بنیادیں اگر نہ ہوں یا کمزور ہوں تو در و دیوار کا بلند ہونا یا قائم رہنا ناممکن ہے۔ اصول اسلام اللہ کا ماننا اس کے تمام صفات کا صحیح صورت سے اعتقاد رکھنا جن میں سب سے زائد اہم وحدت، عدالت، قدرت و علم وغیرہ ہیں اور اس کے بعد نبوت و رسالت و امامت اور اس کے بعد روز جزا و سزا یعنی قیامت، حساب و کتاب، جنت و نار وغیرہ ہیں۔ جن کی تعبیر وحدت، عدالت، رسالت، امامت و معاد سے کی جاتی ہے۔

یہ اصول الفاظ کے اعتبار سے تو بہت آسان ہیں اور انہیں کا اقرار کر لینے سے انسان مسلمان کہا جاتا ہے۔ اور وہ تمام احکام اس کے واسطے جاری ہو جاتے ہیں جو محض دنیا سے تعلق رکھتے ہیں یعنی بلا وجہ اس کا قتل کرنا جائز نہیں ہوتا، کسی شرعی اجازت کے بغیر اس کا مال لینا حرام ہوتا ہے، وہ پاک سمجھا جاتا ہے، اس کے واسطے نکاح و میراث وغیرہ کے تمام احکام جاری ہوتے ہیں مگر یہ شخص اس وقت تک مومن کہے جانے کا مستحق نہیں ہوتا جب تک مذکورۂ بالا تمام اصول اور ان کے معانی صحیح طریقہ سے سمجھ کے دل میں ان کا اس صورت سے یقین نہ کر لے کہ کبھی شک و شبہہ کی گنجائش باقی نہ رہے۔ اسلام و ایمان میں ایک یہ فرق بھی قرار دیا گیا ہے کہ جو محض وحدت و رسالت کو مانے وہ مسلمان ہے اور جو خلافت بلافصل علی ابن طالبؑ اور امامت ائمہ اثناعشرؑ کا بھی اقرار کرے وہ مومن ہے اور یہ کچھ بے محل بھی نہیں کیونکہ اکثر احادیث میں محبت امیر المومنین اور تمام اہل بیتؑ کی محبت کو عین ایمان کہا گیا ہے۔ اسلام آسان ہے اور ایمان مشکل ہے صرف زبانی اقرار کر لینا اور سر تسلیم جھکا دینا چاہے کسی وجہ سے ہو اسلام ہے۔ مگر جب تک ہر ہر رکن ایمانی میں بلا شک و شبہہ یقین کی منزل نہ حاصل ہو جائے اس وقت تک ایمان نہیں آتا اور یہی وہ بلند منزل ہے جس تک ۱۰ فیصدی مسلمان بھی بمشکل پہنچ سکے۔

کوئی بھی نہ سمجھ سکا کہ لا الٰہ الا اللہ میں جس ذات کے الٰہ برحق ہونے کا ہم اقرار کر رہے ہیں وہ ہے کیا۔ اور اس کے صفات کیا ہیں۔ یاد رکھئے کہ اللہ کے صحیح صفات سمجھ لینے ہی سے اللہ کی معرفت حاصل ہوتی ہے اور صفات ہی میں غلطی کرنے سے معرفت میں نقص پیدا ہوتا ہے۔ اگر معاذ اللہ ہم اس بات کے قائل ہوئے کہ اللہ کے جسم و جسمانیات اعضاء و جوارح ہاتھ، پیر موجود ہیں تو معلوم ہوا کہ ہم اس ذات کو نہیں پہچانتے جو خالق عالم ہے بلکہ کسی اور کی خالقیت کے مقر ہیں جو ہرگز الٰہ برحق نہیں ہو سکتا۔

مثلاً آپ سے دریافت کیا جائے کہ زید کو پہچانتے ہو اور آپ اقرار کریں کہ خوب پہچانتے ہیں وہ موٹا تازہ جوان آدمی گورے رنگ کا ہے حالانکہ زید دبلا پتلا سیاہ رنگ ہو۔ تو ہر سننے والا کہہ دے گا کہ آپ زید کو نہیں پہچانتے صرف اس لیے کہ آپ نے پہچاننے کا دعویٰ تو کیا مگر زید کے صفات غلط بتائے۔ یوں ہی جو اللہ کے صفات کو غلط سمجھا وہ دراصل اللہ کو نہیں پہچانتا۔ لہٰذا خدا کی معرفت میں لا الٰہ الا اللہ کا سچا ماننے والا وہی ہے جو اس کے کل صفات کا اقرار کرے اور ان صفات کے صحیح معنوں سے واقف ہو اس لیے ہر مسلمان کا پہلا فرض یہ ہے کہ اگر وہ حقیقی مسلمان بننا چاہتا ہے تو اس کے تمام صفات کو صحیح صورت سے سمجھے اور دل میں ان کا عقیدہ رکھے یوں ہی نبوت کی منزل ہے یعنی صرف محمد رسول اللہ کہہ دینا کافی نہیں ہے جب تک نبوت و رسالت کے معنی اور محمد رسول اللہ کے سچے صفات سے واقف نہ ہو۔

اسی طرح علی ولی اللہ میں اور ہر امام کی امامت تسلیم کرنے میں امامت کے معنی اور صفات امام سے واقفیت ضروری ہے اور ان کے مراتب و منازل کا فی الجملہ سمجھ لینا فرض ہے۔ تاکہ **لا محب غال** (یعنی وہ دوست جو غلو کی منزل تک پہنچ جائے اور امام کو اس کے مرتبہ سے بلند کر کے رسول یا خدا کہہ دے) اور نہ **مبغض قال** (یعنی عداوت کی وجہ سے ائمہ معصومینؑ کی منزل کو گھٹا دے) کے مصداق کی منزل میں داخل ہو۔

اس کے بعد قیامت حشر و نشر، حساب و کتاب جنت و نار صراط و کوثر وغیرہ کے عقیدہ میں اس طرح مستحکم ہو کہ کوئی شک و شبہہ نہ آنے پائے۔

ان تمام منزلوں سے گذر جانے کے بعد فروع دین کی منزل ہے جس کو احادیث معصومینؑ میں ایمان کا کمال قرار دیا گیا ہے بلکہ رکن ایمانی قرار دیا گیا ہے۔

لہٰذا ہمیں چاہیے کہ ایمان حاصل کرنے کی کوشش کریں اسلام اور ایمان کے فرق کو سمجھیں اور محض مسلمان نہ رہیں بلکہ حقیقی مومن بننے کی کوشش کریں مگر اسی کے ساتھ ہی ہر مومن کا فرض ہے کہ صرف عقائد کو صحیح کر لینے پر اکتفا نہ کرے بلکہ عقائد کے ساتھ ساتھ اعمال بھی بجالائے کیونکہ بعض احادیث و اقوال علماء سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عبادات بھی جزو ایمان ہیں اور اگر ایسا نہ بھی ہو تو بھی شرط نجات تو لازماً ہیں جس وقت تک واجبات پر عمل اور محرمات کا ترک نہ ہو اس وقت تک محض ایمان کی وجہ سے بخشش ہو جانا ممکن نہیں قرآن میں بھی ہر مقام پر ایمان کے ساتھ عبادت کا ذکر کر کے اشارہ کر دیا گیا ہے اور احادیث میں بھی صاف صاف کہہ دیا گیا ہے کہ عمل کے بغیر جہنم سے نجات نہیں ہو سکتی۔ نیز یہ بھی تصریح ہے کہ تمام عبادات میں سب سے زیادہ اہم اور افضل یہ نماز پنجگانہ ہے جس کی سترہ رکعتیں دن و رات کے مختلف گھنٹوں میں واجب ہیں۔ ہم اس مقام پر نماز کے متعلق ارشادات معصومین ذکر کر دینا ضروری سمجھتے ہیں تاکہ ہمارا بیان یہ کہہ کر نہ ٹال دیا جائے کہ یہ سب مولویوں کی من گھڑت ہے کہ نماز پڑھو، روزہ رکھو، حج کرو، زکوٰۃ بجالاؤ اس وقت نجات ممکن ہے۔ ہمارے چھوٹے موٹے حدیث خواں ...... بلا شرط و قید کہہ دیتے ہیں کہ بس جس نے اہل بیتؑ سے محبت کی وہ جنتی ہے (چاہے کیسا ہی بدکار و گناہگار کیوں نہ ہو۔)

سچ ہے اور ہم بھی محبت آل محمد کو ایسا ہی سمجھتے ہیں مگر دراصل وہ محبت ہی نہیں کرتا جو اہلبیتؑ کے احکام نہ مانے ان کا پیرو نہ ہو بلکہ ان کی مخالفت کرے۔ کوئی بھی اس محبت کے دعوے کو مانے گا؟ کہ محبوب کہے یہ نہ کرو اور ہم بضد ہوں کہ یہی کریں گے۔ وہ کہے ادھر چلو جدھر ہم چل رہے ہیں۔ ہم کہیں کہ جی نہیں آپ اس طرف جایئے

ہم اس طرف جائیں گے۔ وہ کسی کام کے بنانے میں اپنا خون تک بہا دیں اور ہم اسی کام کے مٹانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیں۔

دنیا کا کوئی بافہم ایسی محبت کو ہرگز سچا نہیں مان سکتا اس لیے اگر احکام معصومینؑ کی اور ان کے طرز عمل کی مخالفت ہو تو محبت کا دعویٰ محض زبانی ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں۔ یہی نماز جس کو احادیث میں تمام اعمال سے بہتر کہا گیا ہے۔ اس کے باقی رکھنے میں معصومین نے کیا کچھ کوشش نہیں کی۔ صفین میں ہزاروں مسلمان قتل ہو گئے، مدتوں لڑائی ہوئی مگر جب امیر المومنینؑ نے عین میدان جنگ میں مصلیٰ بچھوا کے نماز شروع کر دی اور ابن عباس نے عرض کی یا علی یہ مقام نماز پڑھنے کا نہیں ہے تو آپ نے فرمایا کہ اسی نماز کے قائم کرنے کے واسطے جنگ کر رہا ہوں۔

امام حسینؑ کا لڑائی کے عالم میں بلکہ عین جنگ مغلوبہ کے وقت اول وقت پر نماز پڑھنا کیا یہ نہیں بتاتا کہ ان حضرات کی نگاہ میں نماز کی کیا وقعت تھی۔ اب اس کے بعد ہم اسی نماز کی وقعت نہ سمجھیں تو کون قبول کر سکتا ہے کہ امیر المومنینؑ اور امام حسینؑ کی سچی محبت ہمارے دل میں ہے۔

نماز کے متعلق امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں کہ یہ نماز پنجگانہ ہر مومن پر فرض ہے۔ خدا کا یہ عہد ہے کہ جو ان نمازوں کو صحیح صورت سے ان کے وقت پر ادا کر دے گا اس کو خدا جنت میں ضرور داخل کرے گا اور جو ان کو کمال کے ساتھ ادا نہ کرے گا اور انکے وقت کی حفاظت نہ کرے گا (مگر تارک الصلوٰۃ نہ ہوگا) اس کے متعلق خدا کا کوئی وعدہ نہیں ہے اگر چاہے گا تو معاف کرے گا نہ چاہے گا تو عذاب کرے گا۔

امام محمد باقرؑ کا ارشاد ہے: سب سے پہلے میدان حشر میں جس چیز کا حساب ہوگا وہ نماز ہے پس اگر قبول کر لی گئی تو اور اعمال بھی قابل قبول ہو سکتے ہیں۔ پھر فرمایا کہ رسول خدا مسجد میں تشریف فرما تھے کہ ایک عرب نے نماز پڑھنا شروع کی مگر رکوع و سجود کامل نہ کئے (یعنی جلدی جلدی ادا کر دیے) تو رسولؐ نے فرمایا کہ اس نے یوں سجدے کیے جیسے کوا چونچیں مارتا ہے۔ اگر یہ مر گیا اور اس کی نماز کی یہی حالت رہی تو یہ میرے دین پر نہ مرے گا۔ امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں کہ ہمارے رسولؐ نے اپنی حیات کے آخری لمحوں میں (بطور وصیت) فرمایا جس نے نماز کو ہلکا سمجھا اس سے مجھے کوئی مطلب نہیں، جو شراب پیئے وہ ہرگز ہرگز مجھ سے نہیں خدا کی قسم وہ ہرگز حوض کوثر پر نہیں پہنچ سکتا۔

امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں کہ جو بندہ نماز پڑھتا ہے مگر اختصار کرتا ہے تو خدا اپنے ملائکہ سے فرماتا ہے کہ تم دیکھتے ہو یہ بندہ سمجھتا ہے کہ میرے سوا کوئی اور اس کی حاجتیں پوری کرے گا حالانکہ ہر بندہ کی حاجت پوری کرنا صرف میرے اختیار میں ہے۔

امام موسیٰ بن جعفرؑ نے اپنے فرزند امام رضاؑ سے وصیت کی کہ جو شخص نماز کو ہلکا سمجھے گا اس کو میری شفاعت ہرگز نصیب نہ ہوگی۔

بعض روایات میں تارک الصلوٰۃ کی اعانت بہت بڑا گناہ قرار دی گئی ہے۔ یہ تمام چیزیں تو اس وقت ہیں جب نماز کو سبک سمجھے یا کمال کے ساتھ ادا نہ کرے یا واجب ہونے کا یقین کرلے مگر نہ پڑھے لیکن اگر نماز کو واجب ہی نہ سمجھے یا توہین کرے تو ایسا شخص بلا اختلاف مسلمین اسلام سے خارج ہے۔ خدا ہم کو توفیق دے کہ ہم ایمان کے ساتھ تمام عبادات خصوصاً نماز کی پابندی کریں۔

---

*اس شخص کو ہماری شفاعت نصیب نہ ہوگی جو نماز کو سبک (ہلکا) سمجھے۔
*اپنے والدین سے نیکی کرو تا کہ تمہاری اولاد تم سے نیکی کرے۔
(امام جعفر صادق علیہ السلام)

جناب نیازؔ فتحپوری اور معجزات

ناقد بصیر عالیجناب مولانا اختر علی صاحب قبلہ تلہری مرحوم

جناب نیازؔ فتحپوری ملک کے مشہور اہل قلم ہیں۔ آپ کی فکری اور قلمی کاوشوں کا رقبہ موضوعات کے تنوع کے لحاظ سے بہت وسیع ہے خالص ادبی مسائل سے بحث کرنے کے ساتھ مابعد الطبیعیاتی مباحث میں بھی حصہ لیتے رہتے ہیں۔ آپ کی فکر وتحریر کی خاص خصوصیت بیبا کی ہے اور کبھی کبھی یہ بے با کی ایسا تلخ جارحانہ رنگ اختیار کر لیتی ہے جس سے بحث ونظر کی فضا بہت ناخوشگوار ہوجاتی ہے۔

آپ نے جون ۱۹۵۰ء کے نگارؔ میں ''باب المراسلہ والمناظرہ'' کے تحت معجزے کے متعلق مولوی شبیر احمد صاحب کے کسی مقالہ کا جائزہ لیتے ہوئے اظہار خیال فرمایا تھا۔

نیازؔ صاحب کا مذہب کے متعلق جو عمومی انداز نظر ہے اس کے لحاظ سے انہیں معجزات کی عقلی حیثیت پر معترض ہونا ہی چاہیے لیکن مضمون زیر بحث میں جو امر میرے لئے قابل حیرت تھا وہ یہ کہ انہوں نے اعتراض کرنے کے جوش میں علمی ذمہ داریوں کی رعایت بھی نظر انداز کر دی اور معجزے کے امکان کو خلاف عقل قرار دیتے ہوئے ایسی چیزیں لکھ گئے جنہیں مذہب کے حکیمانہ نقطۂ نظر کے لحاظ سے مسترد کر دینا ضروری ہے۔

''معجزہ'' ارباب شریعت کی اصطلاح میں ایسا ''خارق عادت'' امر ہے جس کے ظاہر کرنے سے مدعا یہ ہوتا ہے کہ ایک نبی کے دعوائے نبوت کی تصدیق حاصل ہوجائے۔

خرق عادت سے ارباب شریعت کی مراد یہ ہے کہ دیکھنے میں جو فطرت کی عام معمولی رفتار ہے اس کے خلاف کسی امر کا واقع ہونا دوسرے لفظوں میں کسی شئی کا غیر معمولی اسباب اور غیر عادی وجوہ کے ذریعہ سے صادر ہونا۔ ایسی حالت میں جو چیز عادی اور معمولی اسباب کے ذریعہ سے واقع ہوگی اسے خرق عادت نہیں کہا جائے گا۔

اس تعریف کے دو خاص تضمنات Inplication ہیں ایک تو یہ کہ بشر اس کے وجود میں لانے سے عاجز ہو اور دوسرے یہ کہ اس میں تعلیم وتعلم کا سلسلہ جاری نہ ہو سکے۔

''خرق عادت'' کے اس مفہوم پر غور کرنے سے یہ صاف طور پر معلوم ہوجاتا ہے کہ اس کا تعلق انہیں امور سے ہوسکتا ہے جن میں اپنی ذات کے لحاظ سے وقوع کی ایک امکانی صلاحیت ہو۔ ظاہر ہے کہ اس صورت حال میں وہ چیزیں جن میں وجود میں آنے کی امکانی صلاحیت ان کی ذات کے لحاظ سے نہ ہوگی وہ اس کے دائرۂ عمل میں کسی صورت سے نہیں آسکتیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ایسی چیزوں پر اشیاء کا اطلاق بھی مجازی عنوان سے ہے تاکہ بات چیت میں آسانی ہو اور ممتنع التصور (یعنی جس کا تصور ہی سرے سے ناممکن ہو) کی تھوڑی بہت تصویر کشی ہو سکے۔

خدا کو قادر مطلق شریعت کی زبان میں کہا جاتا ہے لیکن اس کی قدرت مطلقہ کے دائرۂ اثر میں صرف ''محالات عادیہ'' کو لیا

جا تا ہے۔اس کی قدرت کے دائرۂ اثر میں صرف ''محالات عادیہ'' کو لیا جاتا ہے۔''محالات عقلیہ'' کو اس کی قدرت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا یہی سبب ہے کہ خدا کی قدرت کے کے دائرۂ اثر میں تخلیق مثل یعنی دوسرے واجب الوجود (خدا) کا پیدا کرنا نہیں آتا کیونکہ خدا کے مثل کا وجود محال عقلی ہے جس کا تصور ناممکن ہے ممتنع ہے، اسلئے اس سے خدا کی قدرت مطلقہ کا کوئی تعلق ہو ہی نہیں سکتا۔

جب صورت حال یہ ہے تو پھر معجزے کا تعلق محال عقلی سے کیونکر ہوسکتا ہے۔ یہ بات علم کلام کے بہت ہی ابتدائی مسائل سے ہے۔ایسی حالت میں جناب نیازؔ فتحپوری کا فرمانا کہ مولانا نے اپنے مقالہ میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ''معجزہ'' کو محال عادی اور محال عقلی دونوں سے متعلق کرتے ہیں حالانکہ رسولؐ اللہ سے جو معجزے منسوب کئے جاتے ہیں ان میں کوئی معجزہ ایسا نہیں ہے جس کا تعلق محال عادی سے ہو بلکہ سب کے سب محالات عقلیہ سے تعلق رکھتے ہیں — علمی حیثیت سے درخور اعتبار نہیں۔ارباب مذہب رسول اللہ سے جتنے معجزے متعلق کرتے ہیں ان میں کسی کا بھی تعلق محال عقلی سے نہیں ہے، وہ تمام تر محال عادی سے متعلق ہیں۔

جناب نیازؔ کی اس بحث کو پڑھنے سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں ''محال عقلی'' کا کوئی واضح مفہوم نہیں ہے وہ ان چیزوں کو جو عام عادت کے لحاظ سے مستبعد معلوم ہوتی ہیں محال عقلی سمجھ رہے ہیں۔

ایک جگہ انہوں نے ''محال عادی'' کو صاف لفظوں میں ''محال عقلی'' قرار دیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں ''اس میں وہ باتیں شامل نہیں ہیں جو عقلاً محال ہیں مثلاً گیہوں کے درخت سے آم کا پیدا ہونا، جانور کا انسان کی طرح باتیں کرنے لگنا یا دو اور دو کے مجموعہ کا چار سے زائد ہوجانا''

اس میں دو اور دو کے مجموعہ کا چار سے زائد ہوجانا تو ''محال عقلی'' ہے کیونکہ اس کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا لیکن پہلی دونوں باتیں ''محال عادی'' ہیں محال عقلی نہیں ہیں عقل ان کا تصور کرتی ہے ان کے تصور سے تضاد و تناقض وغیرہ کوئی امر لازم نہیں آتا۔

''معجزہ'' کے خلاف جدید فلسفیوں کی جماعت میں ہیومؔ بہت پیش پیش ہیں مگر اس اختلاف کا راستہ دوسرا ہے اور چونکہ اس نے ''معجزہ'' کے بارے میں خواہ مخواہ ہی متحرفانہ اظہار کیا ہے اس لئے اس کے قدم بھی اس راستہ میں بہکے بہکے ہی پڑے ہیں اور خود اس کا فلسفہ ''معجزہ'' کے متعلق اس کے خیالات کی تردید کردیتا ہے۔ ہکسلےؔ مشہور سائنسداں اور فلسفی ہے اور ہیومؔ کے فلسفہ کا ایک حد تک شارح بھی۔اس نے اپنے فاضلانہ مضمون ''ممکنات و ناممکنات'' میں لکھا ہے:

''میں صحیح معنوں میں تناقض کے سوا اور کسی بھی ایسی چیز سے واقف نہیں ہوں جس کو ناممکن کہنا حق بجانب ہو۔منطقی ناممکنات کا وجود ہے لیکن طبعی ناممکنات کا قطعاً کوئی وجود نہیں۔''مربع مدور'' ''ماضی موجود'' ''دو متوازی خطوط کا تقاطع'' یہ چیزیں ناممکنات سے ہیں اس لئے کہ مدور موجود اور تقاطع کا تصور ہی مربع ماضی اور دو متوازی خطوط کے تصور کے متناقض ہے۔لیکن پانی پر چلنا یا پانی کو شراب بنادینا، بچے کا بغیر باپ کے پیدا ہونا، مردہ کو زندہ کردینا، یہ چیزیں مفہوم بالا کی رو سے ناممکنات سے نہیں ہیں۔ہاں اگر ہم یہ دعویٰ کرسکتے کہ فطرت اشیاء کے متعلق ہمارے علم نے تمام ممکنات کا کامل احاطہ کرلیا ہے تو شاید یہ کہنا بجا ہوتا کہ آدمی کے صفات چونکہ پانی پر چلنے یا ہوا میں اڑنے کے متناقض ہیں اس لیے یہ افعال اس کے لئے

ناممکن ہیں۔لیکن یہ حقیقت روز روشن کی طرح ظاہر ہے کہ علم فطرت کی انتہا تک پہونچنا کیسا ابھی تک ہم اس کی ابتدا اور ابجد سے آگے نہیں بڑھے ہیں بلکہ ہماری قوتیں اس قدر محدود ہیں کہ کبھی بھی ہم ممکنات فطرت کی حد بندی نہیں کر سکتے جو کچھ واقع ہو رہا ہے یا ہو چکا ہے اس کا ہم کو علم ہے باقی جو ہونے والا ہے اس کی نسبت ہم صرف ایک توقع کر سکتے ہیں جس کی بنیاد کم وبیش گذشتہ تجربہ کے صحیح سمجھنے پر ہے جس سے ہم کو خیال ہوتا ہے کہ مستقبل ماضی کے مماثل ہوگا۔''

اسی ہکسلےؔ نے معجزات سے بحث کرتے ہوئے اپنے مقالات کی پانچویں جلد میں صاف صاف لکھا ہے'' رہا مریم کے کنوار پن میں مسیح کا پیدا ہونا تو نہ یہ صرف ممکن التصور شے ہے بلکہ علم الحیات کی تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے کہ بعض اصناف حیوانات میں یہ روز آنہ کا واقعہ ہے۔(ہکسلےؔ کے زمانہ میں تحقیق کے قدم اسی منزل تک پہونچے تھےلیکن اب انسانوں میں بھی طبعیات کے ماہرین اس کے وجود کا اعتراف کر رہے ہیں۔ چنانچہ حال کے اخبارات میں کسی ایسی عورت کا وجود تسلیم کیا جا رہا ہے جس کے ہاں بغیر باپ کے ولادت ہوئی۔اختر تلہری) یہی حال ''احیائے موتی'' مردوں کو زندہ کرنے کا ہے کہ بعض جانور مومیوں کی طرح بالکل خشک ہو جاتے ہیں اور عرصہ تک اسی حالت میں رہتے ہیں لیکن جب ان کو مناسب حالات میں رکھ دیا جاتا ہے تو پھران میں جان آجاتی ہے۔''

ان اقتباسوں سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ نئے فلسفی بھی محال عقلی کے متعلق اسی راستہ پر ہیں جو قدیم متکلمین کا تھا۔وہ بھی ان مستبعدات محالات عادی کو ناممکن الوجود نہیں سمجھتے ہیں ان کے نزدیک بھی ان امور کا وجود ممکن ہے۔

اس کی مزید تائید جان اسٹوراٹ مل کے نظام منطق کے بعض اقتباسات سے بھی ہو سکتی ہے۔جنہیں ضرورت پر دیکھا جا سکتا ہے۔

نیازؔ صاحب نے اگر اس سلسلہ میں ''محال عقلی'' کا ذکر نہ چھیڑا ہوتا اور جرمنی کے مشہور فلسفی ہیگل کی پیروی کرتے ہوئے یہ کہا ہوتا کہ: کائنات کا ہر ذرّہ قانون کا پابند ہے اور روہم و بے عقلی انسان کی بدترین دشمن ہے ۔عقل اور حکمت بہترین دوست ہیں لہٰذا ہمارا فرض ہے کہ جہاں کہیں عقیدۂ معجزات کا پتہ چلے اس پر حملہ کریں — تو زیادہ مناسب ہوتا لیکن حقیقتاً ہیگل کا نقطۂ نظر بھی فلسفیانہ استحکام نہیں رکھتا۔

یہ سچ ہے کہ کائنات کا ہر ذرہ قانون کا پابند ہےلیکن سوال تو یہ ہے کہ صحیح قانون کا علم بھی تو ہو۔ہوسکتا ہے کہ ہم نے اپنے ناقص تجربہ علم کی بنا پر جسے قانون سمجھ لیا ہے وہ اصلی و واقعی وحقیقی قانون کی ترجمانی ہو۔حقیقی قانون کے بہت سے عناصر ہماری نگاہوں سے اوجھل رہے ہوں۔ہم اپنے محدود وناقص علم کی وجہ سے جس چیز کے واقع ہونے کو کائنات کے قوانین کی خلاف ورزی سمجھ رہے ہیں وہ در حقیقت قانون کی پابندی ہی کا کوئی مظہر ہو۔علت ومعلول کے حقیقی سلسلہ اور ہر ایک سبب ومسبب کے واقعی لوازم وآثار پر آدمی کا مطلع ہونا ممکن نہیں ہے اس لئے قانون فطرت کو اپنے تجربہ میں محدود کر دینا اور اس سے انحراف کو قانون فطرت کے خلاف کہنا اور پھر اس کے محال ہونے کا دعویٰ کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔

فلسفہ کا فیصلہ تو یہی ہے،اب اپنے توہمات میں الجھی ہوئی فکر ونظر اس سلجھے ہوئے مسئلہ کو جیسے چاہے الجھائے قائلین خدا کے نزدیک اس بحث میں خدا کی مشیت،عزم اور ارادہ کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔سلسلۂ قبل Causation بالآخر اسی مشیت پر ختم ہوگا

بقیہ صفحہ ۴۱ پر

اسلامی معاشرہ پر مغربیت کے اثرات

ایک جائزہ:

عمادالعلماء علامہ ڈاکٹر سید علی محمد نقوی مدظلہ

سماجیاتی نقطۂ نظر سے مغرب کی طرف رجحان کا شمار ایک قسم کی تہذیبی تبدیلی میں ہوتا ہے۔ دوسری تہذیب سے ٹکراؤ کے نتیجے میں ایک تہذیب کی راہ و رسم، اقدار و روایات، خیالات اور رجحانات اور اس کے طور طریقے میں تبدیلی آتی ہے۔ اسے تہذیبی انقلاب یا تبدیلی کا عمل کہا جاتا ہے۔ کچھ ماہرین سماجیات نے اس عمل کا نام سماجی تبدیلی (Social Change) رکھا ہے لیکن اصطلاحی اعتبار سے تہذیبی تبدیلی (Cultural Change) اور زیادہ جامع معلوم ہوتا ہے۔

سماجی تبدیلی اور تہذیبی تبدیلی کی اصطلاحیں جو اس وقت معاصر ماہرین سماجیات کے درمیان رائج اور مقبول ہوگئی ہیں نسبتاً نئی اصطلاح ہیں۔ اس سے پہلے سماجی ارتقا اور سماجی پیشرفت کی اصطلاحیں رائج تھیں۔ مارکس اور اسپنسر نظریہ سماجی ارتقاء کے اہم علمبرداروں میں ہیں، ان کا خیال ہے کہ ہر تبدیلی ناقابل اجتناب شکل میں تکامل اور ارتقا ہے۔ سماجی ارتقا کا نظریہ انیسویں صدی میں رائج ہوا لیکن یہ کوئی نیا نظریہ نہیں تھا یہاں تک کہ Epicurus Lucrtius جیسے فلسفیوں کے افکار و خیالات میں بھی اس کا کچھ سراغ مل سکتا ہے۔

تجدد اور مغرب پرستی کے اسباب اور ذرائع

اسلامی ملکوں میں مغرب کے اثر و رسوخ کے موانع اور اسباب کو مجموعی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱۔ انسانی سرچشمہ	۲۔ مکانیکی اور غیر انسانی سرچشمہ

سب سے اہم انسانی وسائل اور ذرائع جن کے توسل سے یوروپ نے اسلامی دنیا میں رخنہ اندازی کی اور مغربی تہذیب مشرق کی طرف منتقل ہوگئی، درج ذیل ہیں:

۱۔ مغربی سامراج
۲۔ وابستہ دیسی حکومتیں
۳۔ ٹکنوکریٹ
۴۔ بیرونی مشیر
۵۔ شرفاء اور امراء کا طبقہ
۶۔ فری میشن تحریک
۷۔ مستشرقین
۸۔ عیسائی مشنری
۹۔ وہ یوروپین افراد جنہوں نے عارضی یا مستقل طریقے پر اسلامی ملکوں میں سکونت اختیار کر لی تھی۔

مکانیکی اور غیر انسانی سرچشمے درج ذیل ہیں:

۱۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن
۲۔ سنیما اور تھیٹر
۳۔ صنعتی پیداوار اور صنعتی محصولات اور دوسرے سامان

جو یوروپین ملکوں کے بنے ہوئے تھے۔

مغربی کارخانوں کی پیداوار اور محصولات نے جیسا کہ ہم واضح کریں گے اسلامی علاقے کی ساری منڈیوں پر قبضہ کر لیا۔ اس نے عیش پرستی اور منصب طلبی کی روح کو بے انتہا بڑھاوا دیا۔ نئی محصولات اور پیداوار کا استعمال دھیرے دھیرے روایتی طرز زندگی میں انقلاب پیدا کرتا ہے اور انسانوں کو نئے سانچے میں ڈھال دیتا ہے۔ یہ عوام کے درمیان بدیسی تہذیب کی اشاعت ہے لیکن تمام اسلامی ملکوں میں عوام کی بڑی تعداد دیہاتوں یا شہر کے غریب لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے۔

مغربی سامراج: تجدد کا بڑا عامل

اسلامی ملکوں میں مغرب کی طرف رجحان کی اشاعت کا بڑا سبب استعمار یعنی سامراجی طاقت و نظام حکومت ہے۔

مشرقی زبانوں میں لفظ استعمار امپیریلزم اور کلونیلزم کی جگہ استعمال ہوتا ہے۔ امپیریلزم لفظ امپائر سے ماخوذ ہے۔ امپائر کہتے ہیں اس سیاسی تنظیم کو جس میں اقوام اور ممالک ایک جگہ مدغم ہو جاتے ہیں، امپیریلزم اس نوعیت کے نظام کی تشکیل کی طرف میلان کا نام ہے۔ کلونیلزم کا مطلب بدیسی علاقوں پر قبضہ یا بالواسطہ طور پر کسی علاقہ پر اپنی بالادستی قائم کرنا، اردو زبان میں اسے نوآبادیاتی نظام کہا جاتا ہے۔

انیسویں صدی کے دوران سامراجی طاقت نے اسلامی دنیا میں تیزی سے پھیلنا شروع کیا اور ۱۸۵۷ء تک انگریزی سامراج پورے ہندوستان پر مسلط ہو گیا۔ ۱۸۷۹ء میں انگلینڈ اور فرانس نے سرکاری طور پر مصر پر اپنی مراقبت اور نظارت قائم کی۔ ۱۸۸۱ء میں اعرابی پاشا کی بغاوت کے بعد انگلینڈ نے پورے مصر کو اپنے قبضے میں داخل کر لیا۔ عراق، شام، لبنان اور فلسطین پر بھی یوروپین اقوام ہی کا کنٹرول تھا افغانستان، ترکی، ایران اور سعودی عرب جیسے ممالک اگر چہ یوروپ کے نوآبادیاتی علاقوں میں داخل نہیں تھے لیکن بالواسطہ یوروپین سامراج وہاں مسلط رہا۔ ان قوموں کی تقدیر کا فیصلہ انگلینڈ فرانس اور روس کے سفارتخانوں میں ہوتا تھا۔ ان ملکوں کے محروم عوام کے پیروں میں سیاسی اور اقتصادی اسارت کی بیڑیاں پڑی تھیں۔

اسلامی ملکوں میں سامراج کو دو بڑی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا:

الف: دینی جذبہ یا اسلامی احساسات

ب: ملی جذبہ اور نیشنلزم، ان دو اسباب کی وجہ سے بدیسی اثر و رسوخ اور مغربی سامراج کی حاکمیت کی اشاعت کو مزاحمت اور مقابلہ سے دوچار ہونا پڑا۔ سامراجی طاقتوں نے بخوبی سمجھ لیا کہ صرف اسی صورت میں وہ یہاں تک سکتے ہیں اور عوام کی تہذیب و ثقافت پر اثر انداز ہو سکتے ہیں جب کہ مذہب پر ان کے ایمان و یقین کی بنیاد کمزور کر دی جائے اور قومی تہذیب و ثقافت کی جڑیں اکھاڑ دی جائیں، عوام کو روایتی تہذیب و تمدن اور تاریخ سے بیگانہ کر دیا جائے، مغربی تہذیب کی ترویج و اشاعت کی جائے اور عوام کو یوروپ اور اس کے طرز زندگی اور نظام فکر کا دیوانہ اور فریفتہ کر دیا جائے۔ اسی وجہ سے سامراجی طاقت نے اسلامی ملکوں میں مغربی ڈھانچے اور مغرب پرستی کو ٹھونسنے اور لادنے کا عالمی منصوبہ بنایا۔ سامراجی طاقتوں نے واضح طور پر اسلام کی ضدیت اور مخالفت کا احساس کر لیا اور یہ سمجھ لیا کہ اسلام جب تک ایک زندہ طاقت کی شکل میں معاشرہ میں موجود ہے، سامراج کو ہمیشہ اپنی نابودی کا خطرہ رہے گا اور اسے عوام کی بغاوتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ سامراجی طاقتوں نے اپنی آنکھوں سے

دیکھا تھا کہ ان بغاوتوں کا سر کچلنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے اور دوسری طرف عوام کو بھی اس حقیقت کا بخوبی اندازہ ہو گیا تھا تمام مسائل میں یوروپین آقاؤں کے اشاروں پر چلنے کے سوا ان کے پاس کوئی چارہ نہیں رہ گیا۔

۲۔ دوسری طرف مذہبی پختگی نہ ہونے کے سبب لوگ احساس کمتری کا شکار تھے۔ مصر اور ترکی کے فرمانرواؤں کو چونکہ فرانس اور دوسری مغربی طاقتوں کے سامنے شکست کا منہ دیکھنا پڑا تھا اس لیے ان کا خیال تھا کہ یوروپ کی کامیابی کا راز ان کا تہذیب وتمدن، نشست و برخاست اور رقص وسرود میں پوشیدہ ہے۔ اس قسم کی احساس کمتری تاریخ میں بہت سی شکست خوردہ قوموں وافراد کے اندر نظر آتی ہے۔

۳۔ ان میں بیشتر ظالم حکومتوں کو اپنی فوج کے بارے میں وسوسہ رہتا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ ان کی حکومت کی طاقت اور پائیداری فوج اور جنگی ساز وسامان کی رہین منت ہے۔ ان جنگی ساز وسامان کے حصول کے لئے انہوں نے مغرب اور مغربی طاقتوں سے زیادہ سے زیادہ وابستگی اور رابطہ استوار کیا۔

۴۔ عوام کا سب سے روایتی محور اسلام تھا جس کے سہارے وہ فرمانرواؤں کی خودغرضی اور ظلم و جبر کے سامنے سینہ سپر ہوتے تھے۔ جہاد، شہادت اور عدل وانصاف کا جذبہ عوام کو حکمراں طبقہ کے ظلم و جبر اور بے انصافی کے خلاف بغاوت پر آمادہ کرتا تھا۔ اس لئے دوران تاریخ ظالم حکومتوں نے ہمیشہ اس بات کی کوشش کی ہے کہ یا تو مذہب کی غلط تعبیر کریں اور اسے ایک جامد اور راکد اور بے حس وحرکت ڈھانچے کی حیثیت سے پیش کریں جیسا کہ ایران میں عہد قاچار میں ہوا یا مذہبی عقائد اور نظریات کو معاشرہ میں متزلزل کر کے دھیرے دھیرے اس کی جڑیں اکھاڑ دیں (جس کی ایرانی پہلوی حکومت نے کوشش کی) خودغرض حکومتوں کی یہ خواہش رہی کہ عوام کو یا تو جہالت و لاعلمی اور نادانی و بےشعوری کے گڑھے میں پڑے رہنے دیں جہاں وہ مطیع اور پرسکون بن کر رہیں یا بدیسی ڈھانچے کو ان پر زبردستی تھوپ دیں۔ ان کی شخصیت ختم ہو جائے اور سب تہی مغز مغرب زدہ صارفین کی شکل میں آ جائیں تا کہ ان حکمرانوں کے کام سے ان کا کوئی واسطہ نہ رہ جائے۔ مغربی ڈھانچہ کو عوام پر لادنے کی سرگرم کوششوں کے علاوہ فرمانرواؤں نے منفی طور پر بھی مغرب پرستی کی اشاعت کے لئے زمین ہموار کی کیوں کہ ظلم و جبر اور خودغرضی وخودکامی عوام کی تولیدی اور تخلیقی صلاحیتوں کو ختم کر دیتی ہے۔ ان کے جوہر کو زنگ آلود اور معاشرہ کو کمزور کر دیتی ہے اور وہ مغربی نظام کا لقمۂ تر بن جاتا ہے۔

۳۔ بیوروکریٹ طبقہ

بیوروکریٹ طبقہ مغرب پرستی کی دین بھی ہے اور اس کی اشاعت کا سرچشمہ بھی ہے۔ یہ لوگ چونکہ یوروپ کے تعلیم یافتہ تھے اس لئے اندازہ یہ تھا کہ جتنی تیز رفتاری سے مغرب پرستی کی اشاعت ہوتی ہے اتنی ہی تیزی سے ان کی سماجی پوزیشن مضبوط ہوگی۔ اسی وجہ سے اس طبقہ نے اس مقصد کی تکمیل میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔

۴۔ بیرونی مشیر

انیسویں صدی کی مسلم حکومتیں یوروپین اور امریکی مشیر بلانے لگی تھیں۔ بیرونی مشیر حکومتوں کی فوجی، سماجی، اقتصادی اور داخلی سیاست کو مغرب کی سمت موڑ کر درحقیقت مغرب پرستی کی اشاعت اور مشرق کو مغرب سے وابستہ کرنے کا اہم ذریعہ ثابت ہوئے۔

۵۔ مغرب سے وابستہ روشن خیال طبقہ

روشن خیال ایسی اصطلاح ہے جس کا رواج اٹھارویں صدی کے یوروپ میں سماجی علوم اور فلسفہ کے ماہر ایک گروہ کے لئے ہوا۔ اس گروہ کی سب سے اہم خصوصیت سائنس، تجربہ، عقل تشکیک پر یقین، دینی نظریہ اور روایتی باتوں میں شک اور تجدد پسندی و نوفکری تھی۔ سائنس پر انتہا پسندانہ یقین اور سائنس کی پرستش اس کی دوسری نمایاں خصوصیت تھی۔ اس رجحان کا بیج نشاۃ ثانیہ کے زمانے میں بویا گیا جبکہ مفکروں اور دانشوروں نے کلیسا کے ظالمانہ رویہ اور انداز فکر کے خلاف علم بغاوت بلند کر رکھا تھا۔ اس کے بعد علمی ترقی اور فکری تبدیلیاں جیسے نیوٹن کی ایجادات، ڈکارٹ کے نزدیک عقل کی اہمیت اور اسپنوزا کا وحدت کا نظریہ جس کو بیکن اور لاک وغیرہ نے استحکام بخشا اٹھارویں صدی عیسوی کی تحریک روشن خیال کی روح دیدرو کو دائرۃ المعارفی گروہ مونتسکو، الٹر، بوفون تورگو اور تمام فیزیوکریٹ کانت اور بکاریا تھے۔

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں مشرق کے حاکموں اور افسروں کے بچوں کو حصول علم کے لئے یوروپ روانہ کیا۔ اس بیچ کچھ اشخاص نے مغربی افکار و خیالات کی قدر آشنائی حاصل کی۔ یہ لوگ اٹھارویں صدی کے انداز فکر و نظر کو نگاہ میں رکھتے ہوئے یوروپ پر فریفتہ ہو گئے، یوروپ کے مخصوص حالات نیز قرون وسطیٰ کی تاریک ظالمانہ سیاست کی وجہ سے مشرقی ممالک اور یوروپ کے درمیان تہذیبی اور معاشرتی زندگی میں زبردست فرق پیدا ہو گیا۔ ان تمام باتوں سے قطع نظر یہ افراد یہ فکر کرنے لگے کہ کسی طرح اٹھارویں صدی کے یورپ کے افکار و خیالات، تصورات و نظریات اور راہ حل کو اسلامی دنیا بھی سرکاری طور پر تسلیم کر لیں۔ یہ لوگ خود کو منورالفکر یا روشن خیال کہتے تھے کیونکہ ان کے ہاتھ میں مغرب پرستی کا علم تھا البتہ جیسا کہ بعد میں اس راز سے پردہ اٹھا ان میں سے زیادہ تر لوگ سامراجی طاقتوں کے مزدور، کارندے، زرخرید غلام اور دوسری سامراجی تنظیموں کے ممبر تھے اور سامراج کی علمی خدمت میں لگے ہوئے تھے۔ یہ لوگ تیسری دنیا کے ملکوں میں مغرب پرستی کا سب سے اہم اور عظیم انسانی سرچشمہ رہے ہیں۔

یوروپ کی بے چوں و چرا تقلید ان کی نمایاں ترین خصوصیات رہی ہیں۔ انہوں نے روحانیت اور مادیت دونوں ہی میدان میں مغربی ترقیوں کی تعریف کی۔ ان کے نزدیک مشرق کے تمام مسائل کا واحد حل تمام میدانوں میں یوروپین راہ و رسم کی کورانہ تقلید ہے۔ انہوں نے اس بات کی غیر معمولی کوشش کی کہ ان ملکوں کا تہذیبی، سماجی اور سیاسی نظام مغربی ڈھانچے کو اختیار کر لے یہ لوگ مذہب اور قومی روایات کے کٹر مخالف تھے۔

۶۔ مذہبی اقلیتیں بھی مغربی نظام پھیلانے کا ذریعہ رہی ہیں

مصر میں کئی لاکھ قبطی عیسائی اور دوسرے عیسائی فرقے موجود ہیں۔ یہودی اور ارمنی اقلیتیں بھی بااثر ہیں۔ شام، لبنان، اردن اور فلسطین میں بھی تقریباً ایک تہائی آبادی عیسائیوں کی رہی ہے۔ ایران میں ارمنی اور یہودیوں کی اقلیت موجود تھی۔ ایران میں مذکورہ بالا طبقے کے علاوہ زرتشتی مذہب کے پیرو اور بہائی فرقہ بھی در پردہ یا اعلانیہ طور پر موجود رہا ہے۔ ملیشیا کی چالیس فیصد سے زیادہ آبادی عیسائی، ہندو اور بودھ ہے۔ تمام اسلامی ملکوں میں حالات تقریباً ایسے ہی رہتے ہیں۔

بعض اقلیتیں خاص طور سے عیسائی اور یہودی تو تہذیبی اور

مذہبی لحاظ سے یوروپین اقوام کے ساتھ تعلق اور لگاؤ کا بہت احساس رکھتے تھے ۔ ان کے اقتصادی مفادات کا بھی یہی تقاضہ تھا کہ وہ یوروپین سامراج اور سرمایہ داری کے کارندوں کی شکل اختیار کرلیں مادی یوروپین اقوام کی آمد کو اپنے حق میں مفید سمجھتے تھے۔ وہ یہ تصور کرتے تھے کہ اس طرح سے مسلم اکثریت کے دباؤ کے مقابلے میں ان کو پناہ گاہ مل جائے گی۔ اس وجہ سے ان اقلیتوں نے اسلامی دنیا میں یوروپ کے پانچویں کالم کا روپ اختیار کرلیا اور مشرق پر مغرب زدگی کی اشاعت اور اسے زبردستی لادنے میں نمایاں رول ادا کیا ہے۔

ایک نمایاں نمونہ کے طور پر شام، اردن اور فلسطین کے عیسائیوں کا حوالہ دیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے اٹھارویں صدی کے اواخر سے خود کو مغربی حکومتوں کے زیر حمایت کرلیا تھا۔ جب کبھی ان کو مسلمانوں کے ہاتھوں سچ مچ یا جھوٹ موٹ کوئی تکلیف اور اذیت پہنچتی تھی تو وہ مغربی حکومت سے امداد کی درخواست کے ذریعہ علاقے کے داخلی امور میں ان کی مداخلت کا ایک بہانہ فراہم کردیتے تھے۔ ۱۲۷۷ھ/۱۸۶۰ء میں یہ نوبت آگئی کہ ان کی دعوت پر یوروپین اقوام نے لبنان پر فوج کشی کی اور فرانسیسی فوج ایک سال تک وہاں ٹکی رہی۔

تمام اسلامی ملکوں میں مذہبی اقلیتوں کے افراد یوروپ کے تہذیبی سامراج کے ہراول دستہ کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ عرب ملکوں میں پطرس بستانی، ناصف یزجی، ابراہیم یزجی، نوفل نوفل، سلیم نوفل، میخائل شحادہ، سمعان کلہون، جرجیس قیاض اور جیمز ضوع وغیرہ اور ایران میں ملکم خاں اور یفرم خاں جیسے افراد نے مغرب زندگی کی اشاعت میں اہم رول ادا کیا۔ بہت سے عیسائی خصوصاً لبنان کے عیسائی یوروپ اور امریکہ جا کر وہیں آباد ہوگئے اور وہاں کی تہذیب میں غرق ہوگئے۔

مذہبی اقلیتوں کے ذریعہ مغرب کی سامراجی طاقتوں کی حمایت کی دوسری وجہ یہ تھی کہ مغربی سرپرستی کی وجہ سے اس قوم کے لوگ اسلامی ملکوں میں اونچے اور ممتاز عہدوں پر فائز تھے۔ انہیں سامراجی طاقتوں کی سرپرستی حاصل تھی۔ فقط اتنا ہی نہیں بلکہ ان لوگوں کو ظاہری راحت و آرام کے ساتھ ہی ساتھ بہت سے دیگر حقوق اور امتیازات حاصل تھے۔

۷۔ فری میسن

فری میسن خفیہ انجمنوں کی ایک تنظیم ہے جس کا انگریز سامراج اور بعد کے دور میں امریکہ سے براہ راست رابطہ رہا ہے۔ اس کا دعویٰ تو اخوت و برادری کا ہے لیکن اس کا اصل مقصد مغربی تہذیب کو پھیلانا اور سامراج کی خدمت کرنا ہے۔

مغرب پرستی اور مغربی تہذیب کی ترویج و اشاعت میں فری میسن تنظیم ایک اہم عامل رہی ہے۔ اس تنظیم نے اس بات کی سخت کوشش کی کہ اسلامی ملکوں کو ان کی تہذیب سے محروم کردیا جائے اور تہذیبی، اقتصادی اور سیاسی لحاظ سے ان کو یوروپ سے وابستہ کر دیا جائے۔ فری میسن تنظیم نے تمام ملکوں میں ''لژ'' نام کی تنظیمیں یا شاخیں کھولیں جو ان کے منحوس مقاصد کی تکمیل کے لئے ان کی کوششوں کو سازگار بناتی تھیں۔

فری میسن کا لفظی ترجمہ آزاد کاریگر ہے۔ قرون وسطیٰ میں مغربی ممالک میں صنعت کاروں اور کاریگروں نے اس نام سے ایک یونین کی تشکیل کی جہاں وہ شکایت کو یونین کے سامنے رکھتے تھے تاکہ وہ کسی دشواری سے دوچار نہ ہوں اس کے بعد جو تنظیم مخفی اور رمزی انداز میں کام کرنے لگتی تھی اسے فری میسن کا نام دیدیا جاتا تھا۔ سولہویں اور سترہویں صدی میں یہ خفیہ تنظیم بڑی بارونق ہوئی۔

سترہویں صدی میں بہت سے افراد فری میسن تنظیموں میں داخل ہوئے اور اسے سیاسی پہلو عطا کردیا۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے دوران عیسائی مذہبی مبلغین کی طرح سامراج کے لئے راستہ ہموار کرنے والے کی حیثیت سے ساری دنیا میں اس تنظیم کا جال بچھا دیا گیا۔

اس تنظیم کے اصلی اور بنیادی اراکین امراء، شرفاء اور سرمایہ دار اور دولتمند تاجروں کے طبقے سے تعلق رکھتے تھے انیسویں صدی کے اواخر اور بیسوی صدی کے اوائل میں فری میسن تنظیم کی شاخیں سامراجی طاقتوں کے دوش بدوش اسلامی ملکوں خصوصاً ترکی، ایران نیز عرب دنیا میں پھیل گئیں ان کی یہ شاخیں مشرق میں مغربی تہذیب وثقافت اور یوروپی ممالک کی سیاست کی ترویج کا ذریعہ ثابت ہوئیں۔

۸۔ یوروپی مستشرقین

درحقیقت یوروپی اقوام وہ پہلے لوگ نہیں تھے جنہوں نے دیگر تمدنوں کا مطالعہ کیا ہو بلکہ یوروپین تمدن کے منصۂ وجود میں آنے سے صدیوں سال پہلے اسلامی دانشوروں اورادیبوں نے بیگانہ معاشروں کی تہذیب کا مطالعہ کیا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ یوروپین علماء میں اجنبی معاشروں اور ان کی تہذیب کے مطالعہ کا دائرہ زیادہ وسیع کیا۔

قرون وسطیٰ کی یوروپین اقوام کے نزدیک اسلام ایک انتہائی خطرناک مذہب اور طاقتور رقیب تصور کیا جاتا تھا فکری، اعتقادی، سیاسی اور فوجی لحاظ سے اسلام ان کے وجود کے لئے خطرناک تھا۔ انہوں نے دو مقاصد کی تکمیل کے لئے اسلام کا مطالعہ کرنا شروع کیا۔ مسلمانوں کے حملات کے مقابلے میں عیسائیت کا دفاع کرنا اور اسلام پر حملہ کرنے کے لئے لازمی وسائل وامکانات کی فراہمی کے بارے میں مکمل معلومات وآگاہی حاصل کرنا تھا۔

دوسرا مقصد اسلامی تہذیب وثقافت کا مطالعہ تھا کیوں کہ اس زمانے میں اسلامی تہذیب ہی وہ واحد تہذیب تھی جس کی پوری دنیا پر چھاپ تھی۔ جس طرح موجودہ دور میں دنیا کی مختلف قومیں یوروپین اور امریکی تہذیب وثقافت کا مطالعہ کرنے میں لگی ہوئی ہیں اس زمانے میں وہ اسلامی تہذیب وثقافت کی طرف مائل ومتوجہ تھیں۔ یوروپ کے عیسائیوں کو اس بات کا اندازہ ہوگیا تھا کہ فلسفہ، طب، ریاضی، ٹکنالوجی اور تمام علوم وفنون میں مسلمان ان سے بدرجہا آگے ہیں۔ نتیجہ کے طور پر انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ یہ علوم وہ مسلمانوں سے سیکھیں۔ اس طرح یوروپین اقوام کی بیشتر تحریریں جو قرون وسطیٰ میں اسلام کے بارے میں لکھی گئیں، الزامات و بہتان اور لغویات پر مشتمل ہیں جو عیسائی اور یوروپی اقوام کو دین اسلام سے بدظن کرنے کے لئے رشتہ تحریر میں لائی گئیں تھیں۔

نشاۃ ثانیہ اور مغربی تمدن کے ظہور کے بعد اسلامیات کے مطالعہ نے نیا رخ لیا۔ نشاۃ ثانیہ کے بعد دینی محرکات کے ساتھ سیاسی اور اقتصادی محرکات کی بھی آمیزش ہوگئی۔ عثمانی سلاطین کی کوششوں سے بلقان وغیرہ ممالک میں اسلام ترقی کی منزلیں طے کررہا تھا جو نشاۃ ثانیہ کے بعد ایک طرح سے یوروپ کے نوخیز تمدن کے لئے ایک بڑھی دھمکی تھی۔ قسطنطنیہ جو قرون وسطیٰ میں یوروپ کی عیسائی تہذیب کا مرکز تھا اس وقت مسلمانوں کے قبضے میں آگیا۔ بہت سے مغربی دانشوروں کا خیال ہے کہ قسطنطنیہ پر مسلمانوں کے قبضے کی وجہ سے یوروپی دانشور اٹلی اور دوسرے ملکوں میں پھیل گئے اور یہی امر یورپ میں نشاۃ ثانیہ اور بیداری کا ایک اہم سبب ثابت ہوا۔ اس طرح سے یوروپ کا نطفہ

اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت پر قائم ہوا ہے۔ صنعتی انقلاب کے بعد یوروپ کے نوخیز بورژوائی طبقے نے لوٹ کھسوٹ کرنے اور مارکیٹ تلاش کرنے کے لئے وسیع اسلامی دنیا پر نظریں جمادیں۔ ان تمام عوامل کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ دنیا بھر میں مسلمانوں کی مذہبی تاریخ اور تہذیب کے مطالعہ کا یوروپین اقوام میں زیادہ رواج ہوگیا۔

سولہویں صدی عیسوی کے بعد اسلام کے بارے میں دو قسم کی تحریریں یوروپ میں منظر عام پر آئیں:

الف: وہ تحریر جن کا تعلق الٰہیات اور فیلولوجی سے تھا اور عام طور سے اسلامی متون کے مطالعہ اور تحقیق پر مشتمل تھا۔ سب سے زیادہ دھیان انہوں نے عربی زبان اور فارسی متون پر دیا۔ اسلامی ملکوں کی دوسری زبانوں پر ان کی توجہ نسبتاً بہت کم رہی ہے۔

ب: وہ تحریریں جن کا تعلق عثمانی سلطنت اور دوسرے اسلامی ملکوں کے سیاسی، اقتصادی اور سماجی حالات سے تھا۔ اس نوع کی تحریروں میں وہ کتابیں شامل ہیں جو بنیادی اسلام کے سماجی مطالعہ کے سلسلے میں یوروپ میں پہلی دفعہ لکھی گئیں۔ ان میں اہم کتابیں عثمانی سلطنت کے حالات سے وابستہ تھیں۔ درحقیقت انہیں یوروپی اقوام کی جاسوسی کارروائیوں کا ایک حصہ کہا جاسکتا ہے۔ یوروپ والوں کی خواہش تھی کہ دشمن کے بارے میں معلومات فراہم کریں۔

انیسویں صدی میں یوروپ کے اندر مشرقیات کے مطالعہ کا دائرہ بہت وسیع ہوا۔ اس دور میں یہودی علماء نے اسلام کے مطالعہ پر بڑی توجہ دی اس سے قبل یہودیوں کو اسلام کے مطالعہ کا خیال کیوں نہیں آیا۔ سچ تو یہ ہے کہ عالمی سطح پر اس سوال کو بار بار دہرایا گیا لیکن انہوں نے ان کا کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیا۔

تحقیق کے پردے میں مستشرقین کے سامنے اپنے خفیہ مقاصد کی تکمیل تھی۔ پہلا مقصد مسلمانوں میں اسلامی تہذیب وتمدن کے بارے میں حقارت کا جذبہ پیدا کرنا تھا تاکہ ان لوگوں کو اپنی تہذیبی اور نظریاتی شخصیت سے محروم کرتے ہوئے انہیں یوروپین تہذیب کی طرف مائل ہونے کے لئے مجبور کردیا جائے۔

عیسائی مشنری:

عیسائی مشنری نے مغرب زدگی کے رجحان کو آگے بڑھانے میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مسلمانوں کے مذہب کی تبدیلی میں مشنریوں کی کامیابی بہت ہی معمولی رہی ہے خود مشنریوں اور کلیساؤں نے اس شکست کا اعتراف بھی کیا ہے۔ مشنری اگرچہ نوجوان مسلمانوں کو عیسائی بنانے میں کامیاب نہیں ہوسکیں۔ لیکن پھر بھی بنیادی اور ان کے مذہبی اداروں کے مذہبی عقائد پر سخت حملے کرکے ان کے مذہبی عقائد کو کمزور کرنے میں ضرور کامیاب ہوئے ہیں۔ یہ نوجوان طبقہ عیسائی تو نہ بن سکا لیکن غیر مذہبی، مغرب زدہ اور اپنی شخصیت سے محروم ضرور ہوگیا اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ یہ روحانی پادری دراصل مادی اقدار کی اشاعت کرنے والے ضرور ثابت ہوئے۔

مندرجہ بالا تمام گروہوں نے مغربی تہذیب کو پھیلانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔

---

*اول وقت نماز ادا کرو اپنے دین کے ستون کو مضبوط کرو۔
*موت کی یاد بے تکی خواہشات کو دل سے نکال دیتی ہے۔　　(امام جعفر صادق علیہ السلام)

ذمہ داریاں!

خطیب پاکستان مولانا حسن ظفر نقوی اجتہادی (کراچی)

طلباء کی ذمہ داریاں:۔ بدقسمتی سے اب طالب علم دو قسموں پر تقسیم ہو چکے ہیں ایک دینی طالب علم اور ایک دنیاوی طالب علم، لہٰذا ہمیں بھی فی الحال دونوں کو الگ الگ ذمہ داریاں دینا پڑیں گی اس وقت تک جب تک یہ دونوں پھر سے ایک نہیں ہو جاتے۔ مطلب یہ ہے کہ صحیح معنی میں تعلیمی نظام ایسا ہونا چاہیے کہ الگ الگ دینی مدارس اور دنیاوی تعلیمی اسکولوں کے بجائے ایک ہی دانش کدہ میں سارے علوم پڑھائے جائیں پھر آگے چل کر جس کی جیسی صلاحیت ہو اسے اسی میدان میں تخصص Specilalization کرایا جائے تاکہ وہ جس میدان میں بھی جائے ایمان کی دولت سے مالا مال جائے

دینی طلباء کی ذمہ داریاں:۔ کوئی بھی جوان دینی مدرسے میں داخلہ لینے سے پہلے ہزار بار سوچے کہ وہ کس وادی میں قدم رکھ رہا ہے اسے پیشہ ور اور روایتی مولوی بننا ہے یا واقعی دین کی نظریاتی سرحدوں کا نگہبان، خود اس کی مرضی ہے کہ وہ عالم دین بنے یا حالات کا جبر اسے دینی مدرسے تک کھینچ لایا ہے مثلاً معاشی مجبوریاں یا کند ذہنی کے سبب ماں باپ اپسے زبردستی مدرسے میں بٹھانا چاہتے ہیں یا بے چارہ باپ کثیر العیالی اور قلیل آمدنی کے باعث اسے مدرسے کے سر تھوپنا چاہتا ہے۔

بلکہ بعض دفعہ اور بعض جگہ تو یہ بھی مشاہدے میں آیا ہے کہ دینی مدرسہ فقط ایک ہاسٹل کی شکل اختیار کر جاتا ہے دوسرے علاقوں سے آنے والے ہوشیار لڑکے کولجوں میں داخلے لے کر مفت رہائش اور خوراک کی سہولت اس مدرسے سے حاصل کر لیتے ہیں۔ کالج سے فارغ ہوتے ہی مدرسہ سے بھی فارغ ہو جاتے ہیں یا اس وقت تک اپنے قیام کو طول دیتے ہیں جب تک کہیں نوکری نہیں مل جاتی (میری بات کا برا ماننے سے پہلے بعض ایسے مدارس کا دورہ کر کے میری بات کی تحقیق و تصدیق ضرور کر لیں)

مفت طعام و قیام کے علاوہ انہیں ماہانہ وظیفہ کی صورت میں آمد و رفت کا کرایہ بھی مل جاتا ہے۔ یہ تو ہے خیانت اور ایسا فرد سوائے اپنے نفس کو دھوکہ دینے کے اور کچھ بھی حاصل نہیں کر رہا ہے ایسے افراد نہ دین کے خدمت گزار بن سکتے ہیں اور نہ ہی دین کی نظریاتی سرحدوں کے محافظ۔

ایک کند ذہن فرد کو جسے اس کے ماں باپ مدرسہ کے سر تھوپ جاتے ہیں آپ اس سے کیا توقع کرتے ہیں جو دنیاوی تعلیم میں فیل رہا ہو دین کے مسائل کا کیا حشر کرے گا!!

اس کی بے شمار مثالیں محلے محلے اور گلی گلی آپ کو بکھری ہوئی نظر آجائیں گی۔ ظاہر ہے جو آپ بوئیں گے وہی کاٹیں گے۔ جو آپ مدرسوں کے حوالے کریں گے وہی آپ کو واپس ملے گا۔ یہ بات اس زمانے پر ہی موقوف نہیں ہے بلکہ ہر زمانے میں ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔ اقبالؔ نے ہمارے مدارس نہیں بلکہ اپنے ہی مکتب کے مدراس اور ان سے بننے والے مولویوں کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار اس طرح سے کیا تھا ؎

قوم کیا چیز ہے، قوموں کی امامت کیا ہے
اس کو کیا سمجھیں یہ بے چارے دو رکعت کے امام

اس لئے ضروری ہے کہ اس وادی پر خار میں قدم رکھنے سے پہلے ہزار بار فکر کرے، سوچ لے پھر قدم اٹھائے۔ اپنے خدا سے عہد کرے، اپنے آپ سے عہد کرے، مدرسے میں جانے کے بعد اس کا ایک ایک لمحہ وقف دین خدا ہو، اس کی سانسیں وقف دین ہوں۔ اس کی نیند، اس کی بیداری، اس کے افکار، سب مذہب وملت کے لئے وقف ہوں۔ ایک لمحے کیلئے بھی فراموش نہ کرے کہ وہ لشکر خدا کا سپاہی ہے اور لشکر خدا کے سپاہی کو کن کن صفات کا حامل ہونا چاہیے؟ طوالت سے بچنے کے لئے پھر فکر اقبالؔ کا سہارا لیتا ہوں ؎

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

اقبالؔ پر بھی علماء دشمنی کا الزام اسی لئے لگا تھا کہ اس کے سامنے جو علماء تھے وہ انگریزوں کے کاسہ لیس تھے اور اقبال اپنے علماء کو بوذرؓ وسلمانؓ کی طرح دیکھنا چاہتا تھا۔

قوموں کی امامت اور رہبری کوئی آسان مسئلہ نہیں ہے کہ جس نے اپنے جسم پر دستار وقبا سجالی وہ رہبری کا حقدار ہو گیا۔ بلکہ اس کا تعلق ان صفات سے ہے جو انسان اپنے اندر پیدا کر لیتا ہے بلکہ انسان بھی ان صلاحیتوں کو پیدا نہیں کر سکتا وہ تو صرف اپنے اندر اہلیت پیدا کرتا ہے جب اپنے اندر اہلیت ولیاقت پیدا کر لیتا ہے تو پروردگار خود ہی یہ صلاحیت اور منصب اپنے بندے کو عطا کر دیتا ہے۔

عزیزی دینی طالب علمو! ہمارے مدراس کا ماحول اور معیار دوسروں سے کہیں بہتر ہے۔ مگر بعض مرتبہ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بعض انتہائی پاک اور مخلص اور دین کی خدمت کے جذبے سے سرشار ہو کر جوان دینی مدارس میں داخلہ لیتے ہیں لیکن بعض مدارس کے ماحول سے مایوس ہو کر یا تو دینی تعلیم ہی ترک کر دیتے ہیں یا اسی ماحول میں رنگ جاتے ہیں اور ان کا وجود زہر آلود ہو جاتا ہے۔

یقینا جب آپ مدرسے میں داخل ہوتے ہیں اور درس و تدریس کا آغاز ہوتا ہے تو آپ کو سب سے پہلے ان احادیث کو بھی یاد کرایا جاتا ہے اور ذہن نشین کرایا جاتا ہے جس میں طالب علم کی فضیلت اور اس کے مقام کو بیان کیا گیا ہے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ جب کوئی گھر سے تحصیل علم کے لئے نکلتا ہے تو ملائکہ اس کے قدموں تلے اپنے پر بچھا دیتے ہیں لیکن یہی طالب علم جب مقصد سے ہٹ کر صرف دنیا کے حصول میں مبتلا ہو جاتا ہے تو پھر ملائکہ نہیں بلکہ شیطان اپنی آنکھیں اس کے لئے فرش راہ کر دیتا ہے اور اسی دین کے مبلغ سے دین کی تخریب کا کام لیتا ہے۔ خدا ہمارے دینی طالب علموں کو شیطان مردود سے اپنی پناہ میں رکھے۔

تو اب دینی مدرسے میں رہتے ہوئے ہر وقت اپنی چوکیداری بھی کرنا ہے۔ دوسرے کیا کر رہے ہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونا چاہیے۔ ہر دور میں یہی کچھ ہوتا رہا ہے سیکڑوں بلکہ ہزاروں انسان عالم بنتے جاتے ہیں مگر ان ہزاروں میں سب کے سب خمینیؒ، بہشتیؒ، مطہریؒ، حسینیؒ نہیں بن جاتے بلکہ ہزاروں میں کوئی ایک ایسا نکلتا ہے جو معاشرے میں انقلاب برپا کرنے کی صلاحیت حاصل کر لیتا ہے

جس طرح ایک صدف حاصل کرنے کے لئے برسوں غوطہ خور بے شمار سیپیاں نکالتا ہے اسی طرح ہزاروں طلبہ میں کوئی ایک امام کی نیابت کا حقدار بنتا ہے۔

معاشرے کی اصلاح کے لئے ضروری ہے کہ پہلے خود اصلاح کے مرکز اور سرچشمہ کی اصلاح کی جائے۔ علم صرف کتابیں پڑھ لینے کا نام نہیں ہے۔ علم تو ایک نور ہے، ایک روشنی ہے، ایک آگہی ہے، شعور کی معراج ہے، علم تو آفاق کی وسعتوں میں گم ہو جانے کا نام

ہے۔ مدرسہ، کتاب استاد یہ سب اسی گوہر نایاب کو حاصل کرنے کے وسائل ہیں۔ جب میں دینی مراکز کی اصلاح کی بات کر رہا ہوں تو میری مراد ان مدارس سے نہیں ہے جو پاک اور باصفا علماء کے زیر نگرانی ایمانی اور روحانی ماحول میں چل رہے ہیں بلکہ میری مراد وہ ادارے ہیں جہاں انتظامی صلاحیتوں سے محروم افراد ان مدارس اور اداروں کے سرپرست بنے بیٹھے ہیں۔

بقیہ نیاز فتحپوری۔۔۔۔۔۔۔۔

ورنہ انسانی ذہن کو ''تسلسل'' سی محال چیز کے سلسلہ میں مسلسل ہو کر ناکارہ ہو جانا پڑے گا۔

عام طور سے آگ کا کام جلانا سمجھا جاتا ہے اور ہمارا عمومی تجربہ بھی یہی ہے لیکن مشیت ایزدی ''**یانار کونی بردا و سلاما علیٰ ابراهیم**'' کے مطابق جلا دینے والی حرارت کو خاص حالات میں معتدل برودت میں تبدیل کر سکتی ہے اور اپنے ہی بنائے قوانین کے تحت تبدیل کر سکتی ہے۔ کسی چیز سے اس کے خواص ظاہر ہونے کے لئے بہت سے شرائط ہوتے ہیں۔ اور ایسے بہت سے طبیعی موانع ہو سکتے ہیں جو ان کے ظہور کو روک دیں اس لئے **قل کل یعمل علی شاکلته فلن تجد لسنة الله تبدیلا و لن تجد لسنة الله تحویلا خلق کل شئی فقدر لاتقدیراً کل شئی عند لا بمقدارہ** وغیرہ آیات کے مفہوم کو اس سے ذرا بھی خلاف ورزی لازم نہیں آتی۔ سنۃ اللہ قانون فطرت وغیرہ کسی چیز کو مطلقاً قرار دے دینا آسان ہے لیکن اس حقیقت پر علمی حیثیت سے حاوی ہو جانا بہت ہی مشکل ہے اور انسان کے اس نقص و عجز کا برابر تجربہ ہوتا رہتا ہے۔

ایک بات اور نیاز صاحب نے ولادت نبویؐ کے وقت ایوان کسریٰ میں زلزلہ آنے کو معجزے سے تعبیر کیا ہے حالانکہ اصطلاح علم کلام میں ایسے خارق عادت امور کے وقوع کو جو قبل دعویٰ نبوت واقع ہوں ''ارہاص'' کہا جاتا ہے۔

اس بحث کے آخر میں نیاز صاحب نے یہ بات البتہ ٹھیک لکھی ہے کہ ''اب وہ زمانہ نہیں کہ رسول اللہ کی عظمت کو ان دلائل سے ظاہر کیا جائے کہ آپ کے جسم کا سایہ نہ تھا آپ کی رسالت کی گواہی کنکریوں نے دی، درختوں نے جھک کر آپ کو سلام کیا بلکہ وقت کا اقتضا یہ ہے کہ رسول اللہ کے اسوۂ حسنہ اور ان کے غیر معمولی بلند کردار کو پیش کر کے بتایا جائے کہ محمدؐ کتنا بڑا انسان تھا اور جو تعلیم اخلاق اس نے پیش کی ہے وہ کتنی جامع، کتنی مکمل اور کس درجہ بلند ہے'' ہمارے واعظین کرام اور مبلغین کو اس مشورہ پر سنجیدگی سے عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ زمانہ کی پسندیدگی کا معیار بدل چکا ہے کسی چیز کی اہمیت اور عظمت کے پرکھنے کا انداز اب دوسرا ہے اسی لئے انہیں بھی اپنے موعظت و تبلیغ کے راستے بدلنے کی کوشش کرنا چاہیے۔

امام علی علیہ السلام نے فرمایا:

* فرزند کا باپ پر ایک حق ہوتا ہے اور باپ کا فرزند پر ایک حق ہوتا ہے۔ باپ کا حق یہ ہے کہ بیٹا ہر مسئلہ میں اس کی اطاعت کرے معصیت پروردگار کے علاوہ۔ اور فرزند کا حق باپ پر یہ ہے کہ اس کا اچھا سا نام تجویز کرے اور اسے بہترین ادب سکھائے اور قرآن مجید کی تعلیم دے۔ (نہج البلاغہ کلمات قصار/۳۹۹)

اسلام میں علم کا مقام

حجۃ الاسلام محمد صحفی صاحب

ترجمہ:۔ جناب محمد فضل حق صاحب

جن مسائل کو اسلام میں بے حد اہمیت دی گئی ہے اور جن کے بارے میں بہت زیادہ تاکید اور سفارش کی گئی ہے ان میں سے ایک مسئلہ علم و دانش کا ہے۔

حصول علم کو اسلامی فرائض اور دینی واجبات میں شمار کیا گیا ہے۔ ہم یہ نہیں چاہتے کہ اس کتاب میں 'علم و دانش' کے عنوان کے تحت اسلام کی تبلیغ کریں اور قرآن مجید، روایات اور تاریخ اسلام سے مطالب نقل کریں اور کہیں کہ اسلام نے یوں علم کی تائید کی ہے اور لوگوں کو اس کے حصول کی ترغیب دلائی ہے۔

نہیں، ہمارا ایسا کوئی ارادہ نہیں اور پھر یہ گمان بھی نہیں گزرتا کہ یہ مسئلہ کسی سے پوشیدہ ہو۔ نیز اس سلسلے میں اتنا کچھ کہا اور لکھا جا چکا ہے کہ اس کی تکرار کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی۔

علاوہ از ایں اس قسم کے مطالب بیان کرنا اور لکھنا بھی دکھ کی دوا نہیں ہے کیونکہ صدیوں کی تقاریر اور تحریروں کے باوجود مسلمانوں کی موجودہ حالت ایسی ہے جیسی کہ ہم دیکھ رہے ہیں۔

علامہ فقید مرحوم شرف الدین عاملی نے جو ایک بے مثل عالم اور لبنانی شیعوں کے بے نظیر پیشوا تھے سالہا سال تک تکالیف برداشت کیں اور اہل تشیع اور امامیہ دانشوروں کو متعارف کرانے کے لیئے بڑی قیمتی اور مفید کتابیں لکھ کر شائع کیں لیکن جب یہ سب تکالیف اٹھا کر اور صعوبتیں برداشت کر کے انہوں نے لبنان کے شیعوں کی ناگفتہ بہ حالت پر نظر ڈالی تو انہیں یہ دیکھ کر بہت افسوس ہوا کہ وہ لوگ بہت ہی گھٹیا سطح پر ہیں۔ انہوں نے دیکھا کہ لبنان کی آبادی کے مختلف طبقات میں سے سب سے زیادہ نادار، مفلوک الحال اور پسماندہ طبقہ شیعہ ہی ہیں۔ ان میں کوئی ڈاکٹر، انجینیئر، پروفیسر یا دوسرے گرامی قدر لوگ نہیں ہیں اور اگر ہیں بھی تو ان کی تعداد اتنی کم ہے کہ قابل توجہ نہیں۔ البتہ قلی، حجام، حمامی اور خاکروب کے پیشے اہل تشیع نے اپنا رکھے ہیں۔ ان بزرگوار نے یہ حالات دیکھ کر دل ہی دل میں سوچا کہ شیعہ طبقے کی اس پسماندگی اور مفلوک الحالی کے پیش نظر میری تصانیف کا کیا اثر ہو سکتا ہے۔ جو لوگ میری کتابیں پڑھیں گے اور ساتھ ہی ساتھ شیعوں کی حالت دیکھیں گے وہ تو کہیں گے کہ اگر شیعہ مذہب ایک مفید اور نجات بخش مکتب فکر ہوتا تو ضروری تھا کہ اس مکتب کے پیروؤں کی حالت بھی بہتر اور زیادہ آبرومندانہ ہوتی۔

اس غور و فکر کے نتیجے میں ان بزرگوار نے کمر ہمت کس لی اور فیصلہ کیا کہ وہ عملاً شیعوں کی حالت بہتر بنائیں گے اور ایک بنیادی اور ہمہ پہلو انقلاب برپا کر دیں گے۔

انہوں نے بہت سی رفاہی انجمنیں اور اسکول قائم کیئے اور اپنے حامیوں کی بھرپور امداد کے ذریعے اس قابل ہو گئے کہ لبنان کے شیعوں کے حالات بہتر بنائیں اور انہیں جہالت اور پسماندگی سے نجات دلائیں۔

بلاشبہ یہ بڑی تعجب خیز بات ہے کہ ہم مسلمانوں نے فقط باتوں پر اکتفا کیا اور علم و دانش کی راہ پر چلنے سے باز رہے۔

امام علی علیہ السلام نے اپنے آخری وصیت نامے میں تمام مسلمانانِ عالم کو خبردار کیا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ غیر (یعنی غیر مسلم) قرآن مجید کی اعلیٰ وارفع تعلیمات پر عمل درآمد کے معاملے میں تم پر سبقت لے جائیں اور تم پیچھے رہ جاؤ۔ (نہج البلاغہ)

فرانسیسی دانشور ڈاکٹر گوسٹاولوبون یوں رقمطراز ہے:

''جس زمانے میں اسلامی تمدن اُندلس میں اوج کمال پر تھا ہمارے علمی مراکز ان قلعوں سے عبارت تھے جن میں ہمارے امراء ورؤسا نیم وحشیانہ زندگی بسر کرتے تھے اور اپنے ان پڑھ ہونے پر فخر کرتے تھے۔ ہم عیسائیوں میں سب سے زیادہ علم والے وہ نادان راہب تھے جو اپنی تمام عمریں اس کام پر صرف کر دیتے تھے کہ گرجوں اور خانقاہوں سے یونان اور روم کی کتابیں نکالیں، ان کی تحریریں مٹا دیں اور اس کے بجائے ان اوراق پر مذہبی کلمات واوراد پر مبنی چیزیں لکھ دیں۔''

وِل ڈیورنٹ (Will Durant) اپنی کتاب 'تاریخ تمدن' (History of Civilization) میں لکھتا ہے:

''قرون وسطیٰ میں مسلمان علوم کے میدان میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ مراکش اور آذر بائیجان میں ریاضیات کے شعبے میں بے حد ترقی ہوئی جس سے ایک دفعہ پھر اسلامی تمدن کا کمال واضح ہو گیا۔ نباتیات کا علم جسے تھیوفراسٹس (Theophrastus) کے بعد بھلا دیا گیا تھا مسلمانوں کے ذریعے ایک دفعہ پھر زندہ ہو گیا۔ ادریسی نے نباتیات پر ایک کتاب لکھی اور ۳۶۰ جڑی بوٹیوں کے خواص بیان کیئے۔ اس کی توجہ صرف طبی مسائل تک ہی محدود نہ تھی بلکہ اس نے سائنس اور نباتیات کے بارے میں بھی بحث کی ہے۔

دوسرے ادوار کی طرح اس دور میں بھی ایشیا، افریقہ اور یورپ کے بڑے بڑے طبیب مسلمان ہی تھے۔

ہسپتالوں کی تعمیر اور ان کے لیئے ضروری ساز وسامان مہیا کرنے میں بھی مسلمانوں نے اہل دنیا کی رہنمائی کے فرائض انجام دیئے۔ جو ہسپتال نور الدین نے ۵۵۶ ہجری بمطابق ۱۱۶۰ عیسوی میں تعمیر کرایا اس میں تین سو سال تک تمام مریضوں کا مفت علاج کیا جاتا تھا اور ادویات بھی بلا معاوضہ فراہم کی جاتی تھیں۔ تمام بڑے بڑے اسلامی شہروں میں دیوانوں کی دیکھ بھال کے لیئے پاگل خانے موجود تھے۔''

جس زمانے میں یورپ اور عیسائیت جہالت اور نادانی کی آگ میں جل رہے تھے مسلمان ایک ایسے عالیشان تمدن کے مالک تھے جس کی محض ایک جھلک مؤرخین نے ہمیں دکھائی ہے۔

بلا شبہ جو تمدن مسلمانوں کو میسر آیا وہ اسلام کی تعلیمات کی بدولت تھا کیونکہ اسلام سے پہلے وہ بھی جہالت اور فساد میں غرق تھے اور تواریخ سے یہ امر بخوبی واضح ہے کہ وہ کتنی بری زندگی گزار رہے تھے۔

اسلام ایک وسیع اور جچے تلے لائحۂ عمل اور مفید اور نجات بخش تعلیمات کے ساتھ آیا۔ اس نے اس فاسد اور غلیظ معاشرے کو قدم بقدم نیک بختی کی جانب چلایا اور جاہل اور پسماندہ افراد سے ایک عالم اور ترقی یافتہ ملت کی تشکیل کی۔

تحصیل علم کے لیئے اسلام نے کوئی قید یا شرط قبول نہیں کی اور اسے تمام اشخاص کے لیئے (خواہ وہ عورتیں ہوں یا مرد) عمر کے تمام ادوار میں، ہر مقام پر اور ہر استاد کے ذریعے جو میسر ہو، واجب اور لازم قرار دیا۔

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے وہ آنحضرتؐ سے نقل کی گئی مندرجہ ذیل چار مختصر احادیث سے بخوبی ثابت ہو جاتا ہے:

۱۔ طلب العلم فریضۃ علیٰ کل مسلم

''علم و دانش حاصل کرنا ہر مسلمان پر واجب ہے۔''

اس جملے میں ایسی کوئی قید اور استثنا نظر نہیں آتی جیسی کہ اسلام کے بہت سے دوسرے احکام میں وجود رکھتی ہے اور اس میں مرد اور عورت کے مابین کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ لفظ ''مسلم'' کے معنی 'مسلمان' کے ہیں خواہ وہ عورت ہو یا مرد۔

مندرجہ بالا حدیث میں رسول اکرمؐ نے اہل عالم پر واضح کر دیا ہے کہ علم ایک لازمی وظیفہ اور عمومی فریضہ ہے اور کسی معین طبقے یا خاص جنس سے مخصوص نہیں ہے۔

۲۔ اطلبوا العلم من المهد الیٰ اللحد

''گہوارے سے قبر تک (ولادت سے موت تک) علم و دانش کی طلب کرو۔''

اس فرمان میں موسم اور وقت کی قید اٹھا دی گئی ہے اور یہ اعلان کیا گیا ہے کہ علم و دانش کے حصول کے لیئے کوئی موسم یا وقت مقرر نہیں۔ اس کی ابتدا دنیا میں آنکھ کھولنے پر ہوتی ہے اور خاتمہ انسانی زندگی کے خاتمے پر ہوتا ہے۔

۳۔ الحکمۃ ضالۃ المومن اینما وجدها اخذها

''حکمت مومن کا گمشدہ مال ہے اور جس کی چیز گم ہو جائے اسے وہ جہاں بھی ملے اس کو اٹھا سکتا ہے۔''

حکمت مستحکم، معقول اور درست باتوں سے عبارت ہے۔

اس حدیث میں واضح کیا گیا ہے کہ انسان کو اس بات کی پروا نہیں کرنی چاہیئے کہ حکمت اور علم کس جگہ سے دستیاب ہے حتیٰ کہ اگر مشرکوں اور منافقوں سے بھی علم کا حصول ممکن ہو تو اسے حاصل کرنا چاہیئے۔

یہاں یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مندرجہ بالا جملے میں لفظ 'حکمت' استعمال ہوا ہے جس سے مراد یہ ہے کہ درست اور معقول بات جو شخص بھی کہے اسے قبول کر لینا چاہیئے لیکن شرط یہ ہے کہ اس بات کے درست ہونے میں کوئی شک و شبہ نہ ہو لہٰذا جو لوگ درست اور غلط باتوں میں تمیز کرنے کی اہلیت نہ رکھتے ہوں انہیں ہر ایک کی بات سن کر پلّے نہیں باندھ لینی چاہیئے بلکہ کوشش کرنی چاہیئے کہ ایسے اشخاص کا اثر اور تلقین قبول نہ کریں جو انہیں گمراہ کر دیں۔

۴۔ اطلبوا العلم و لو بالصین

''علم سیکھو خواہ وہ چین ہی سے حاصل کرو۔''

اس حکم میں جگہ کی قید اڑا دی گئی ہے اور واضح کر دیا گیا ہے کہ علم خواہ دنیا کے دور دراز حصوں میں ہی کیوں نہ دستیاب ہو اور اس کے حصول کے لیئے کتنا ہی وقت کیوں نہ صرف ہو اور کتنی ہی تکلیف کیوں نہ اٹھانی پڑے انسان کے لیئے لازم ہے کہ اسے حاصل کرے۔

اوپر نقل کیئے گئے چار جملوں کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر مسلمان کے لیئے زندگی کے ہر دور میں وہ جہاں کہیں بھی ہوں علم و دانش کے حصول کی جستجو ضروری ہے اور یہ امر ایک دینی فریضہ ہے۔

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے وہ علم و دانش کے حصول کے سلسلے میں اسلام کے ارشادات کا نمونہ ہے اور جیسا کہ شروع میں کہا گیا تھا ہمارا مقصد اس موضوع پر اسلام کے احکامات گنوانا نہیں ہے۔ صدر اسلام کے مسلمانوں نے صدیوں تک ان مقدس تعلیمات پر عمل کیا اور نتیجے کے طور پر تمام اقوام عالم میں سرفراز رہے۔

مسلمانوں میں بہت بڑے طبیب، گرامی قدر کیمیا داں، جغرافیہ داں، ماہرین فلکیات اور علم و فن کے دوسرے شعبوں میں مہارت رکھنے والی شخصیتیں پیدا ہوئیں جن کا ذکر ہم اشارتاً پہلے کر چکے

ہیں۔ جو حضرات زیادہ تفصیل کے خواہشمند ہوں انہیں چاہیئے کہ تاریخ تمدن از جرجی زیدان، تاریخ تمدن از وِل ڈیورنٹ، تمدن اسلام و عرب از گوستاولوبون اور فہرست ابن ندیم جیسی کتابوں سے رجوع کریں۔

جن باتوں کا ذکر اوپر کیا گیا ہے انہیں مدنظر رکھتے ہوئے کیا یہ افسوس کا مقام نہیں ہے کہ گو مسلمانوں کو نجات بخش دینی تعلیمات میسر ہیں، ان کا تاریخی ماضی بیحد درخشاں ہے اور ان میں عظیم اور قابل علمی شخصیتیں پیدا ہوئی ہیں پھر بھی وہ خواب غفلت میں ڈوب جائیں حتیٰ کہ مدارج علمی سے قطع نظر ان کی اکثریت لکھنے پڑھنے کی صلاحیت سے بھی محروم ہو اور ہر معاملے میں ان کا دست سوال اسلام کے دشمنوں کی جانب دراز رہے! اس سلسلے میں قرون وسطیٰ میں مسلمانوں کی غفلت اور استعمار پسند عیسائیوں کی تخریب کاری اس بدبختی اور کم نصیبی کے دو بنیادی عوامل ہیں۔

ایک غلط فہمی

بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اسلام میں علم سے مراد فقط علم دین اور مبدأ و معاد (قیامت) کی معرفت اور انفرادی اور اجتماعی وظائف اور عبادات وغیرہ ہے حالانکہ کلمۂ 'علم' اکثر مواقع پر بطور مطلق استعمال ہوا ہے اور اس پر کوئی شرط عائد نہیں کی گئی۔

علاوہ از ایں اسلامی معاشرے کے بارے میں اسلام کے منتہائے مقصود کو مدنظر رکھتے ہوئے پتا چلتا ہے کہ 'علم' فقط ایک علم تک محدود نہیں ہے۔

اسلام چاہتا ہے کہ تمام مسلمان ارجمند، آزاد اور بے نیاز ہوں۔

اسلام چاہتا ہے کہ مسلمان معاشی اور معاشرتی طور پر آزاد ہوں۔

اسلام یہ بھی چاہتا ہے کہ مسلمان تمام مادی اور روحانی معاملات میں دوسری اقوام عالم سے برتر ہوں۔

یہ مقاصد حاصل کرنے کے لیئے ضروری ہے کہ اسلامی معاشرے میں مختلف علوم وفنون پر دسترس رکھنے والے ممتاز دانشمند موجود ہوں اور ہر شعبے میں ماہرین خصوصی اپنے فرائض انجام دیں۔

اگر معاشیات، زراعت، طب، صنعت اور دور حاضر کے دوسرے علوم وفنون کے میدان میں ہمارے پاس ماہرین نہ ہوں تو ہم یقینا دوسروں کے محتاج رہیں گے اور یہ صورت حال اسلام کے مقاصد کے قطعاً خلاف ہے۔

لہٰذا ہمارا دینی فریضہ ہے کہ ہر شخص خواہ اس کی حیثیت اور مقام کچھ ہی کیوں نہ ہو علم و دانش پھیلانے کے لیئے کوشش کرے اور وہ جو کچھ جانتا ہو دوسروں کو بھی سکھائے۔ اپنا علم، مقالات اور کتابیں لکھ کر اور مجالس مذاکرہ اور کانفرنسیں تشکیل دے کر دوسروں تک منتقل کرے۔ جو مفید کتابیں دوسری زبانوں میں لکھی گئی ہوں انہیں اپنی زبان میں ترجمہ کرے۔ نوجوانوں کو علم و دانش کے حصول کی جانب راغب کرے، انہیں اپنی تعلیم جاری رکھنے اور ترقی کے مدارج طے کرنے کی تلقین کرے۔ لائبریریاں اور علمی مراکز قائم کرکے نوجوانوں کا قیمتی وقت ضائع ہونے سے بچائے اور مفید کتابیں خرید کر بلا معاوضہ طالبان علم کو مہیا کرے وغیرہ وغیرہ۔

یہ بھی ضروری ہے کہ علم کی ترویج اور توسیع کا یہ مقدس فریضہ ایک اس سے بھی زیادہ مقدس فریضے یعنی معاشرے میں ایمان کی تقویت اور اچھے اخلاق کی ترویج سے مخلوط ہو۔

یہ لازم ہے کہ علمی ترقی کے پہلو بہ پہلو روحانی اور اخلاقی

اصول بھی تقویت پکڑیں تا کہ واضح اور مفید نتائج حاصل ہوں اور علم کو معاشرے کی خوشحالی کے لیئے استعمال کیا جا سکے ورنہ روحانیت کے بغیر علم ایسا ہی ہوگا جیسے کہ ایک مست زنگی کے ہاتھ میں تلوار دیدی جائے۔

علم کے خلاف جنگ

عیسائی استعمار پسندوں نے اپنے کارندوں اور ایجنٹوں کے ذریعے مسلمانوں کے جوان اور روشن خیال طبقوں کے درمیان یہ راگ الاپنا شروع کر دیا ہے کہ مسلمان ممالک کی پسماندگی کی وجہ ان کا مذہب ہے اور اگر وہ اس پسماندگی سے نجات حاصل کرنا چاہیں تو یہ اسی وقت ممکن ہے جب وہ اپنے آپ کو مذہب کی قید سے آزاد کر لیں تا کہ جس طرح عیسائیوں نے دین مسیحی سے رہائی حاصل کر کے بے پناہ ترقی کی ہے اسی طرح وہ (یعنی مسلمان) بھی متمدن قوموں کی مانند ترقی کر سکیں۔

ان لوگوں نے یہ مغالطہ اور خلط مبحث جان بوجھ کر پیدا کیا ہے تا کہ وہ مسلمان نوجوانوں کو گمراہ کر کے اسلامی ممالک کا زیادہ وسیع پیمانے پر استحصال کر سکیں اور مسلمانوں کو پسماندہ ہی رکھیں۔

یہ صحیح ہے کہ عیسائیوں نے جو پیشرفت کی وہ کلیسا کے بندھن کو توڑ کر ہی کی اور پادریوں کے خود ساختہ مذہبی قواعد وضوابط کو ٹھکرا کر ہی ترقی کی راہ پر گامزن ہوئے لیکن کلیسا کی خرافات کا مقابلہ اسلام کے جاودانی قواعد اور احکامات سے کرنا ایک بہت بڑا مغالطہ اور غیر انسانی ظلم ہے۔

کلیسا نے عیسائی پادریوں کے گھڑے ہوئے بچکانہ قوانین کے ذریعے علم اور فن کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کر دیں اور دانشمندوں اور محققین پر بے پناہ سختیاں کیں۔ اس نے چند برائے نام علمی افکار اور نظریات کے مجموعے پر مقدس آسمانی قوانین کی مہر لگا کر یورپی معاشرے پر ٹھونس دیا اور جب سائنس نے یہ ثابت کر دیا کہ کلیسا کہ خیالات غلط ہیں تو لوگوں کے لیئے اس کے سوا کوئی چارہ باقی نہ رہا کہ وہ کلیسا اور اس کے قوانین سے بیزار اور برگشتہ ہو جائیں اور اپنے آپ کو پادریوں کے جال سے آزاد کر کے علم و دانش پر ایمان لے آئیں۔ اس دوران میں جو چیز کلیسا اور اس کے دین کے سقوط میں معاون ثابت ہوئی وہ پیشوایان کلیسا کا اپنی کھوئی ہوئی آبرو اور حیثیت کی بحالی پر اصرار تھا۔

ان کا یہ اصرار اس حد تک جا پہنچا کہ وہ اپنے نظریات پر عملدرآمد کرانے کے لیئے آمریت اور جبر کی جانب مائل ہو گئے۔ وہ ایک خوفناک عفریت کی طرح لوگوں کی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہو گئے اور ان کی آسائش اور آرام سلب کر لیا۔

کلیسا کہ پیشواؤں کے احکام کے مطابق تحقیقات کے خطرناک ادارے ''ادارۂ تفتیش عقائد'' کا قیام عمل میں آیا۔ یہ ادارہ کلیسا کے نظریات کے مخالفین پر بے حد سختی کرتا تھا اور علماء اور دانشمندوں کو سزائیں دیتا تھا۔ کچھ دانشمندوں کو محض اس جرم کی پاداش میں آدم سوز بھٹیوں میں ڈال کر جلا دیا گیا کہ وہ زمین کے مدوّر (گول) ہونے اور حرکت کرنے کے قائل ہو گئے تھے اور اس طرح ایک حقیقت کا انکشاف کیا تھا۔

یہ تشدد اس حد تک پہنچ گیا کہ تمام روشن خیال لوگوں نے اس امر کو اپنا فریضہ سمجھ لیا کہ اس ظالم دیو کو نیست و نابود کرنے کے لیئے ایک دوسرے سے تعاون کریں اور اس کی سرکوبی کے لیئے اپنی قوتوں کو کام میں لائیں تا کہ کلیسا ہمیشہ کے لیئے مقابلے کے میدان سے خارج ہو جائے اور اس کی قوت ہمیشہ ہمیشہ کے لیئے ختم ہو جائے۔

روشن خیال لوگوں، محققین، دانشمندوں اور دوسرے تمام

ترقی پسند اور وسیع النظر اشخاص کے ساتھ کلیسا کا یہ سلوک تھا۔

ظاہر ہے کہ یورپ کی ترقی اور کامیابی کا راز اس ادارے کی قید سے آزادی اور نجات میں پوشیدہ تھا جس نے دین اور آسمانی قوانین کے نام پر علمی ترقی کا راستہ روک رکھا تھا۔

تاہم جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان کے درمیان ایسے غم انگیز حوادث بطور نمونہ بھی دیکھنے میں نہیں آتے اور جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے اسلام محض علم و دانش کا موید ہی نہیں بلکہ لوگوں کو علم حاصل کرنے کا شوق دلاتا ہے اور ان کی پشت پناہی کرتا ہے۔

لہٰذا یہ خیال کہ مذہب قوموں کی ترقی میں مانع ہے کلیسائی مذہب کے بارے میں تو درست ہے لیکن جہاں تک اسلام کا تعلق ہے یہ کہنا ایک بہت بڑی دشمنی ہے جو ہمارے دشمن، مسلمانوں کے دلوں میں پیدا کررہے ہیں تا کہ ہمیں لاپروا اور سرکش بنا کر اپنے استعمار پسندانہ مقاصد میں کامیاب ہوسکیں۔

ان حالات میں سب مسلمانوں کا یہ قطعی اور لازمی فریضہ ہے کہ اس پروپیگنڈے کا مقابلہ کریں اور اسلام کے نورانی حقائق کو جو انسانیت، فضیلت، ترقی اور سربلندی کی روح کو پروان چڑھاتے ہیں معاشرے میں رائج کریں اور اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں اپنی ذمے داری پوری کریں۔

بقیہ علی علیہ السلام-------------

جس میں مخلوق کی بھلائی مضمر ہوتی تھی مثلاً ایک مریض کو آپریشن کی ضرورت ہے جسمیں مریض کی جان کا بھی خطرہ ہے لیکن ڈاکٹر اور مریض کے ورثاء اس امید پر کہ مریض کی جان بچ جائے آپریشن کرتے ہیں جسمیں مریض کی خیر خواہی و محبت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اسی طرح سے علیؑ کی تادیبی عدالت حدود و قصاص، امراض اخلاقی کے لئے بطور آپریشن کے تھی جو مخلوق خدا کی بھلائی کی غرض سے تھی اور مظاہرۂ محبت تھا۔ اس کے علاوہ علی مرتضی کی عدالت محض خدا کی محبت کی وجہ سے تھی اور ظاہری کوئی سختی اور تشدد ہو مالک کے حکم کی تعمیل ہے جسمیں مرضیٔ خداوندی کے مقابل میں ماسوااللہ بے حقیقت ہے۔ جیسا کہ انجیلی مسیح ایک مقام پر حکم دیتا ہے کہ ''ایک گال پر جو طمانچہ مارے دوسرا گال بھی اسی کی طرف کر دو اور جو ایک میل جائے اس کے ساتھ دو میل چلے جاؤ''

دوسرے موقع پر فرماتے ہیں ''میں صلح کرانے نہیں تلوار چلانے آیا ہوں'' عدالت ہی کیا مظاہر محبت میں سے ایک مظہر ہے جو ایک کے لئے اگر سیاست ہے تو دوسری حیثیت سے اسی کے حق میں محبت ہے۔

دیکھو محبت کی ضد نفرت و بغض و عداوت ہے اسی طرح سے عدالت کی ضد بھی نفرت و بغض و عداوت ہے۔ ناانصافی، ظلم و تشدد جس طرح سے خلاف عدالت ہے اسی طرح سے خلاف محبت ہے۔ اگر عدالت و محبت میں تباین ہوتا تو ایک دوسرے کے ساتھ جمع بھی نہ ہوسکتے۔ بیشک محبت حیوانی اور محبت غیر صحیحہ تو ضد عدالت ہے لیکن محبت صحیحہ عقلائی عین عدالت ہے۔ نفرت و بغض و عداوت جن اوقات میں محبوب ہے وہ عین عدالت ہے اور محبت صحیحہ عقلائی درحقیقت وہی ہے کہ نفرتی چیزوں سے متنفر رہو اور مبغوض چیزوں سے بیزار رہو اور یہی عین عدالت ہے۔ لہٰذا علوی معاشرت جہاں محبت ہے وہاں عین عدالت بھی ہے۔

تقلید کیا ہے......؟

آیت اللہ العظمیٰ سید العلماء سید علی نقی النقوی صاحب قبلہ
آیت اللہ العظمیٰ علی مشکینی اردبیلی صاحب قبلہ

قرآنی ثبوت

خود قرآن مجید نے مسائل دینیہ کے علم کا جو طریقہ مقرر کیا ہے وہ یہی ہے ارشاد ہوتا ہے :**فلو لا نفر من کل فرقة منهم طائفة لیتفقهوا فی الدین و لینذروا قومهم اذا رجعوا الیهم لعلهم یحذرون**۔ کیوں نہیں ان میں سے ہر جماعت میں سے ایک گروہ سفر کرتا تا کہ وہ مسائل دینیہ کو سمجھیں اور واپس آنے کے بعد اپنی قوم کو ڈرائیں یعنی فرائض شرعیہ پر متنبہ کریں، شاید کہ وہ ڈریں یعنی فرائض پر عمل پیرا ہو جائیں۔

یہاں ان لوگوں کے لیئے جو دور دراز مقامات پر رہتے ہیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ ان میں سے ایک گروہ کو سفر کرنا چاہیئے تا کہ وہ مسائل دینیہ کو حاصل کریں۔

یہاں (**لیسمعوا**) نہیں ہے جس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ ''احادیث کو سنیں'' اور اس کا تعلق پھر صرف روایت اخبار سے ہوتا بلکہ (**ولیتفقهوا**) کی لفظ ہے یعنی سمجھیں اس کا تعلق معانی سے ہے اور ان کا سمجھنا استنباط ہے پھر جب وہ واپس جاتے ہیں تو انہی احکام کو اپنی قوم تک پہنچاتے ہیں اگر ان کے بتائے ہوئے احکام پر دوسروں کو عمل کرنا درست نہ ہوتو اس پہنچانے کا کوئی حاصل ہی نہیں ہے پھر صراحت کے ساتھ ارشاد ہوتا ہے کہ وہ لوگ ڈریں یعنی ان کے بیانات سے متاثر ہوں۔اس کا عملی نتیجہ صرف یہ ہے کہ وہ ان احکام و فرائض کو بجالانے لگیں۔اسی کو تقلید کہتے ہیں۔

احادیث

احادیث میں بھی اس کا ثبوت موجود ہے اس سلسلہ میں چند روایات پر اکتفا کی جاتی ہے۔

ا۔نجاشی جو علماء شیعہ میں ہیں اپنی علم رجال کی معروف کتاب میں امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے اپنے شاگردوں میں سے ایک ممتاز شاگرد ابان کو فرمایا :''یاابان **اجلس فی المسجد وافت الناس فانی احب ان یریٰ فی اصحابی مثلک**۔اے ابان مسجد مدینہ میں بیٹھا کرو اور فتوے دیا کرو کیونکہ مجھے پسند ہے کہ میرے اصحاب میں تمہارے ایسے لوگ دکھلائی دیں۔''

ابان جو مجتہد اور صاحب فتویٰ تھے امام علیہ السلام نے ان کو فتویٰ دینے کا حکم فرمایا تا کہ لوگ سنیں اور اس پر عمل کریں اور امامؑ کی نظر میں تمام مجتہدین اور صاحب فتویٰ ابان کی طرح ہیں یعنی حکم امامؑ کے مطابق ہر شخص کے لیئے جو خود مجتہد نہیں ضروری ہے کہ اپنے مورد ابتلاء مسائل میں کسی مجتہد کی تقلید اور اس کے فتووں پر عمل کرے۔

۲۔کتاب وسائل الشیعہ (مذہب شیعہ میں حدیث کی مستند کتاب) کے باب ۱۱ کتاب القضاء میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت نقل کی گئی ہے کہ آپ نے 'معاذ' نامی شخص کو

فرمایا: **بلغني انک تقعد في الجامع و تفتي فيه قلت نعم يجئ الرجل اعرفه بمودتكم و حبكم فاخبره بما جاء عنكم فقال (ع) اصنع "ثم ملخصا"** اے معاذ میں نے سنا ہے کہ تو مسجد میں بیٹھ کر لوگوں کو فتوے دیتا ہے؟ میں نے عرض کی یا حضرت ایسا ہی ہے، جو کچھ میں نے آپ سے حاصل کیا ہے آپ کے محبوں اور دوستوں کے لیئے بیان کرتا ہوں آپ نے فرمایا ایسا ہی کرو۔

معاذ معصومین علیہم السلام سے حکم الٰہی کا استنباط کر کے فتویٰ کی صورت میں لوگوں کو بتاتے تھے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے بھی معاذ کے اس عمل کی تایید فرمائی۔ امام علیہ السلام کی نظر میں معاذ اور دوسرے مجتہدین یکساں ہیں یعنی مجتہدین کا فتویٰ لوگوں کے لیئے حجت ہے اور اس پر عمل کرنا ضروری ہے۔

۳۔ کتاب وسائل الشیعہ باب ۱۱ کتاب القضاء میں عبد العزیز نامی ایک شخص حضرت امام رضا علیہ السلام کی خدمت میں عرض کرتا ہے۔ یا حضرت میرا گھر بہت دور ہے میں اپنے مورد ابتلاء مسائل پوچھنے کے لیئے آپ کی خدمت میں حاضر نہیں ہوسکتا۔ آیا آپ یونس بن عبد الرحمٰن کی تایید فرماتے ہیں اور میں اس سے اپنے دینی مسائل حاصل کر سکتا ہوں؟ امام علیہ السلام نے فرمایا: ہاں۔

یہ وہی اجتہاد و تقلید کا نظام ہے جو اس وقت قائم ہے یہی اس وقت بھی قائم تھا بیشک اس وقت اجتہاد آسان تھا اس لیئے کہ ائمہ معصومینؑ موجود تھے اور زیادہ شبہات و توہمات کے پردے حائل نہیں ہوتے تھے۔ اس وقت اجتہاد زیادہ مشکل ہوگیا ہے کیونکہ اختلافات کی کثرت، شبہات کی فراوانی اور عہد ائمہؑ سے دوری ہوگئی ہے لیکن اس سے حقیقت اجتہاد پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور نہ تقلید کے معنی میں کوئی تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ کتاب وسائل الشیعہ باب ۱۰ کتاب القضاء میں حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام کی تفسیر سے نقل ہے:

فاما من كان من الفقهاء صائنا لنفسه حافظا لدينه مخالفا لهواه مطيعا لامر مولاه فللعوام ان يقلدوه

مجتہدین اور فقہاء میں سے جو شخص اپنے آپ کو گناہوں سے محفوظ رکھنے والا، اپنے دین کی حفاظت کرنے والا، خواہشات نفسانی کی مخالفت کرنے والا اور حکم خدا کی اطاعت کرنے والا ہو تو عوام پر لازم ہے کہ اس کی تقلید کریں۔

ہمیں گذشتہ مطالب سے یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ عوام میں سے ان لوگوں پر جو دینی مسائل اور احکام الٰہی سے پوری طرح مطلع نہیں ہیں لازم ہے کہ کسی مجتہد (فقیہ) یعنی اس فن کے ماہر شخص کی تقلید و پیروی کریں۔ اگر چہ وہ لوگ دوسرے علوم وفنون میں خود ماہر اور متخصص (specialist) کیوں نہ ہوں جیسا کہ مجتہد و فقیہ کے لئے بھی دوسرے علوم وفنون میں درپیش مسائل میں متخصص اور ماہر فن کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے۔ پس یہ کہنا بجا ہوگا کہ اس دنیا میں صحیح اور عقلی زندگی کی بنیاد تقلید پر ہے کیونکہ معاشرے کے تمام افراد نہ فقط تمام علوم وفنون میں ماہر و متخصص نہیں بن سکتے بلکہ درپیش مسائل کا حل بھی نہیں نکال سکتے جس کی وجہ سے معاشرہ کا ہر فرد دوسرے کا محتاج ہے۔ مثلاً ڈاکٹر کے لیئے مکان بنانے میں معمار کی طرف اور معمار کے لیئے بیماری میں ڈاکٹر کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے اور ان دونوں کے لیئے دینی مسائل میں مجتہد و فقیہ کی طرف رجوع کرنا اور اس کی تقلید کرنا لازم ہے۔

پس تقلید کا لازم و واجب ہونا عقل وخرد کے علاوہ قرآن اور احادیث کی رو سے بھی ثابت ہے۔

امام حسن عسکری نے فرمایا:
* عقلمند وہ شخص ہے جو الٰہی احکامات کے آگے سر جھکائے۔

حمد باری تعالیٰ

شاعر اہلبیت سید اشتیاق حسین رضوی ساحرؔ فیض آبادی (کراچی)

تو احد ہے، صمدیت تری لا ثانی ہے
میری نظروں میں عجب عالم حیرانی ہے

ذرّہ ذرّہ حرمِ زیست کا نورانی ہے
دیدہ و دل میں وہ جلووں کی فراوانی ہے

حاصلِ فہم بشر ہے تری وحدت کا شعور
شرک انسان کی سب سے بڑی نادانی ہے

تیرا جلوہ ترے محبوب میں دیکھا میں نے
تیری صورت تری تصویر سے پہچانی ہے

کیا کہوں اس کو اگر نہج بلاغت نہ کہوں
جس کا لہجہ تری توصیف میں قرآنی ہے

عبدیت کی وہی منزل تو ہے معراجِ بشر
خم جہاں سجدۂ معبود میں پیشانی ہے

بات بنتی ہے ترے نام پہ مر مٹنے سے
روح ایمان یہی جذبۂ قربانی ہے

ہم خطاکاروں پہ بھی تیری عطا کم نہ ہوئی
کچھ زیادہ ہی اب احساس پشیمانی ہے

تم بھی سجدہ کرو ساحرؔ اسی در پر کہ جہاں
سر جھکانا سبب عظمت انسانی ہے

منقبت

درمدح سبط اکبر حضرت امام حسن علیہ الصلوٰۃ والسلام

تذہیب سرگروری

ذکر توصیف حسن اچھا لگا
یہ ادب آموز فن اچھا لگا

ایک چادر میں ہیں سب عالم پناہ
اجتماع پنجتن اچھا لگا

رنگ و بو میں فرق ملتا ہی نہیں
سب کو احمد کا چمن اچھا لگا

مستیوں میں رند پڑھتے ہیں درود
آج کا دیوانہ پن اچھا لگا

مدح مولا حمد خالق بن گئی
اپنا اسلوب سخن اچھا لگا

صلح تیری روح جنگ کربلا
یہ رسولانہ چلن اچھا لگا

تیری خاموشی بنی تیغ علی
تیرا یہ طرز سخن اچھا لگا

قبر ہے جلوہ گہہ آل نبی
زندگی کا یہ گہن اچھا لگا

بزم مدحت نے کیا سورج کا کام
چرخ سے اپنا وطن اچھا لگا

رفعتیں بخشے ہے ذکر پنجتن
منبر دار و رسن اچھا لگا

جس دہن سے مدحت مولا سنی
میرے دل کو وہ دہن اچھا لگا

بہر حسنین نبیؐ ہے سبز و سرخ
یہ زمیں اچھی گگن اچھا لگا

میت سبط نبیؐ پر ظلم کیوں
تجھکو کیا ناوک فگن اچھا لگا

لکھتا ہوں تذہیبؔ ہر دن منقبت
یہ فریضہ عادتن اچھا لگا

قرآن حکیم

بمناسبت تاریخ نزول قرآن در ماہ رمضان

شاعر آل محمد حضرت نجم آفندی طاب ثراہ

بے عمل مسلم یہ غفلت معرفت کا خون ہے
کچھ خبر بھی ہے کہ قرآں زیست کا قانون ہے

یہ جبین عقل پر ہے علم کی تابندگی
اس کے ہر اک لفظ میں ہے زندگی ہی زندگی

اس کی قرأت سے ہے روشن عالم کن کی فضا
اس نے پیدا کی ہے پاکیزہ تمدن کی فضا

ہوگئی کچھ اور ہی وقعت فن تجوید کی
رتل القرآن ترتیلا نے جب تائید کی

نور کی لہروں سے ذہن آدمیت ڈھل گیا
حکم اقرأ آتے ہی اک باب حکمت کھل گیا

ایک صامت رہنما ہے یہ خدا کی راہ کا
ہے زباں احمدؐ کی اور پیغام ہے اللہ کا

گل نہ ہوگا جو کبھی ایسا چراغِ طور ہے
نسل آدمؑ کے لئے اک آخری دستور ہے

جادۂ اخلاق میں تدبیر منزل ہے یہی
خلق میں انسانیت کا درس کامل ہے یہی

ہے ہر اک موضوع پر افہام بھی تفہیم بھی
ذکر حق بھی اور حق الناس کی تعلیم بھی

سیدھے سادے چند لفظوں میں کچھ ایسا کہہ گیا
فلسفہ قرآن کا منہ دیکھتا ہی رہ گیا

دل جلوں نے فرق سمجھا آگ میں اور دھوپ میں
اشتراکیت دکھائی اس نے اصلی روپ میں

یہ مکمل درس ہے انساں بنانے کے لئے
اک نصاب زندگی ہے ہر زمانے کے لئے

کیوں نہ لایخلوعن الحکمۃ ہو فرمان حکیم
امن عالمگیر ہے مقصود قرآن حکیم

اس کے سر سہرا ہے بسم اللہ کی تنصیب کا
اس کے سر پر تاج ہے اسلام کی تہذیب کا

تجھ کو باب العلم سے حاصل ہے فخر انتساب
روئے معنیٰ سے الٹ اے دوست لفظوں کی نقاب

پوچھ ہر معلوم و نا معلوم باب علم سے
آیتیں قرآں سے لے مفہوم باب العلم سے

نشر کر اپنے عمل سے شرع کے پیغام کا
ہے اگر مسلم نمونہ بن رہ اسلام کا

کون ہیں جو احسان کی سختی سہتے ہیں
بدلے میں دنیا سے نہیں کچھ لیتے ہیں
ہاتھ کے دھوون سچے موتی بن بن کر
کس کی سچائی کی گواہی دیتے ہیں

اسیف جائسی

قرآن کی فریاد

جناب ماہر القادری صاحب

طاقوں میں سجایا جاتا ہوں آنکھوں سے لگایا جاتا ہوں
تعویذ بنایا جاتا ہوں دھو دھو کے پلایا جاتا ہوں

جزدان حریر و ریشم کے اور پھول ستارے چاندی کے
پھر عطر کی بارش ہوتی ہے خوشبو میں بسایا جاتا

جس طرح سے طوطا مینا کو کچھ بول رٹائے جاتے ہیں
اس طرح پڑھایا جاتا ہوں اس طرح سکھایا جاتا ہوں

جب قول و قسم لینے کے لیئے تکرار کی نوبت آتی ہے
پھر میری ضرورت ہوتی ہے ہاتھوں پہ اٹھایا جاتا ہوں

دل سوز سے خالی رہتے ہیں آنکھیں ہیں کہ نم ہوتی ہی نہیں
کہنے کو میں اک اک جلسہ میں پڑھ پڑھ کے سنایا جاتا ہوں

نیکی پہ بدی کا غلبہ ہے سچائی سے بڑھ کر دھوکہ ہے
اک بار ہنسایا جاتا ہوں سو بار رلایا جاتا ہوں

یہ مجھ سے عقیدت کے دعوے قانون پہ راضی غیروں کے
یوں بھی مجھے رسوا کرتے ہیں ایسے بھی ستایا جاتا ہوں

کس بزم میں میرا ذکر نہیں کس عرس میں میری دھوم نہیں
پھر بھی میں اکیلا رہتا ہوں مجھ سا بھی کوئی مظلوم نہیں

پردہ دار

رضا جائسی

لطف ہی کیا پھر اگر وہ پردہ دار آیا تو کیا
بیقراری میں نہ جب دل کو قرار آیا تو کیا
زندگی میں صورت تسکیں ہو یہ ممکن کہاں
نقد جاں لٹنے پہ وہ جان بہار آیا تو کیا

مرے مولا تمہیں آنا ہی ہے آؤ شتاب آؤ
صف نسواں میں آیا ہے غضب کا انقلاب آؤ
جہاں سے ختم ہوتی جارہی ہے رسم پردے کی
رکھو اسلام کا اب آکے پردہ بے نقاب آؤ

عظمت سورۂ قرآں ہمیں معلوم نہیں
صرف طغروں ہی سے کمروں کو سجا رکھا ہے

نجم آفندیؒ

قصیدہ در مدح نواسۂ رسول الزمن حضرت امام حسن علیہ السلام

لسان الشعراء سید مجاور حسین نقوی تمنا جائسی

اُدھر تو فاطمہ کی گود میں روئے حسن چمکا
اِدھر فرط مسرت سے رخِ خیبر شکن چمکا

مہِ روزہ کی پندرہویں کو جب روئے حسن چمکا
تو رشک آیا جناں کو یوں مدینے کا چمن چمکا

اذاں میں نام احمدؐ سن کے یوں روئے حسن چمکا
شب معراج جیسے چہرۂ شاہ زمن چمکا

گلستاں میں شجر یوں چاندنی کا آج چمکا ہے
شب مہ میں عروس نو کا جیسے پیرہن چمکا

ضیائے روئے شبرؑ تیری ضو میں ہو گئی شامل
مقدر اور بھی اب تیرا اے شمع لگن چمکا

خوشی نے آج یوں پہلو میں میرا دل کیا روشن
صدف کے بطن میں جیسے کہیں دُرّ عدن چمکا

پکار اٹھے یہ سب ہے ایک جوہر دار آئینہ
ترا تختہ کچھ ایسا باغ میں اے نسترن چمکا

خوشی سے دفعتاً دل یوں ہی چمکا تیرہ بختی میں
اندھیری رات میں مار سیہ کا جیسے من چمکا

یہ کس کمسن ادا کو آج تھم تھم کے ہنسی آئی
کہ اک کوندا سا رہ رہ کر تہہ چرخِ کہن چمکا

نظر کی خیرگی سے دید نا ممکن نہ ہو جائے
ارے اتنا بھی محفل کو نہ شمع انجمن چمکا

پکارا میں نئی اک گوہر غلطاں پہ اب آئی
نہاتے وقت جب آب مصفّا سے وہ تن چمکا

گلستاں کی طرح صحرا میں بھی جوش مسرت ہے
وہ دیکھو چوکڑی بھرتا ہوا کوئی ہرن چمکا

تصور اس لبِ رنگیں کا آیا یہ مرے دل میں
کہ گھر کے تنگ گوشے میں کہیں لعل یمن چمکا

جھکی جاتی ہے چشمِ نرگسِ شہلا اب اے سنبل
ارے یوں تو نہ زلفیں او گلستاں کی دلہن چمکا

یہ کس کے نور رخ سے یوں مری تربت ہوئی روشن
کہ دل چمکا جگر چمکا جبیں چمکی کفن چمکا

چمک کر باغ کے ذروں نے سارا باغ چمکایا
کہیں تو تختۂ نسریں کہیں پر نسترن چمکا

دلوں پر بجلیاں گرتی ہیں آنکھیں جھپکی جاتی ہیں
ارے یوں تو نہ تیغ برق دم اے تیغ زن چمکا

بپا ہوں لاکھ ہنگامے مگر ویسا نہ چمکے گا
علی کی تیغ سے جنگ احد میں جیسے رن چمکا

رضا جائسی

یوں بدلنے کو تو بدلے گی مشیت ایک دن
خوب تھا ہم بھی جو کر لیتے زیارت ایک دن

اتنے دن غیبت کے کیا کم تھے غموں میں جو کٹے
رہ گئی ہو کاش اب میعاد فرقت ایک دن

منقبت

در شانِ امام حسن علیہ السلام

ڈاکٹر عباس رضا نیرؔ جلالپوری

شجاعتوں نے عجیب انداز سے قصیدہ لکھا حسنؑ کا
جہاں پہ تھی ذوالفقار حیدرؑ وہیں قلم رکھ دیا حسنؑ کا

چمن چمن کی ہے سرخ پھولوں نے سبز شال اوڑھ کر تلاوت
بہار آئی ہے ڈالی ڈالی پہ جشن ہونے لگا حسنؑ کا

اسی کی شادابیوں کو طوبیٰ کی چھاؤں کہنے لگے فرشتے
بہشت کو مل گیا تھا اک پیرہن اتارا ہوا حسنؑ کا

نشان قدموں کے پتھروں پر ابھار دیتا تھا جو محمدؐ
اسی محمدؐ کے دوش اطہر کا چاند ہے نقش پا حسنؑ کا

ورق ورق پڑھ رہا ہے قرآں اسی کے کردار کا قصیدہ
حکومتوں کے مٹائے سے مٹ سکے گا کیا تذکرہ حسنؑ کا

ہے کتنا روشن خدا کا چہرہ یہ صاحبان یقیں سے پوچھو
بھلا تذبذب کی آنکھ دیکھے گی کس طرح معجزہ حسنؑ کا

کہاں جلال جبین ہاشم کہاں امیہ کے اندھے وارث
یہ شام کی مصلحت کے چہرے کریں گے کیا سامنا حسنؑ کا

یہاں تو نوک قلم بھی پھولوں کی پنکھڑی کی طرح رواں ہے
یہ دم کسی تیغ میں کہاں ہے جو طے کرے راستہ حسنؑ کا

ہے مطمئن چہرۂ امامت، حکومتیں تھرتھرا رہی ہیں
بجا ہے بروقت برمحل ہے قدم قدم فیصلہ حسنؑ کا

کہاں گیا ظلمتوں کا حاکم کہاں گئی شام کی حکومت
سبھی سویروں کی سرحدوں پر ہے آج تک دبدبہ حسنؑ کا

جہاد کی منزلیں بھی آتی ہیں امن کی راہ سے گذر کر
اگر سمجھنا ہے کربلا کو تو صلح نامہ اٹھا حسنؑ کا

ہزار بدلے جہاں کے موسم ترا پھریرا ہے سبز اب تک
سلام اے کربلا کے پرچم کہ رنگ تجھ کو ملا حسنؑ کا

مدینے والوں سے کوئی کہہ دے کہ دیکھ لیں پھر علیؑ کی ہیبت
زمین مقتل اٹھانے والا ہے تیغ پر لاڈلا حسنؑ کا

جہاں لہو کی عبارتیں ہیں وہیں پہ مسموم حرف بھی ہیں
کتاب مقتل ہے یا ہے متن حسینؑ پر حاشیہ حسنؑ کا

جو شخص اب تک سمجھ نہ پایا نبیؐ کی صلح حدیبیہ کو
اسے قیامت تلک سمجھ میں نہ آئے گا فلسفہ حسنؑ کا

کلیجہ انسانیت کا کب تک چبائے گی سازشوں کی ڈائن
جناب حمزہؑ سے ملتا جلتا ہے کس قدر واقعہ حسنؑ کا

سوال تھا یہ لحد میں مجھ سے میں کون ہوں میرا دین کیا ہے
جواب میں میں اٹھا اور اٹھ کے قصیدہ پڑھنے لگا حسنؑ کا

تو ہی بتا اے خدائے برتر کہ اور کیسے میں تجھ سے مانگوں
میرے لبوں نے دعا کے حرفوں میں رکھ دیا واسطہ حسنؑ کا

مجال کس کی جو ایک قطرے میں کل سمندر سمو کے رکھ دے
ثنا کے قرضے اتار پائے گا کیا کوئی قافیہ حسنؑ کا

قلم کو ہچکی سی آ رہی ہے حروف نیلے پڑے ہیں نیرؔ
مرے لہو اب جگر کے ٹکڑوں پہ تو ہی لکھ مرثیہ حسنؑ کا

خبرنامہ

جناب اعجاز رضوی صاحب

روزہ اللہ کی جانب سے امت محمدؐیہ کے لیئے بہترین تحفہ: مولانا کلب جواد صاحب

اے صاحبان ایمان! اپنے کو اور اپنی اولاد کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔ (قرآن کریم) جمعہ کے موقع پر تاریخی آصفی مسجد میں موجود ہزاروں لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے شیعہ قائد مولانا کلب جواد صاحب نے رمضان المبارک کی فضیلت بتاتے ہوئے کہا کہ امت محمدؐیہ سے پہلے کی تمام امتوں میں بھی روزہ واجب تھا لیکن مخصوص تھا صرف انبیاءؑ اور رسولوںؑ کے لیئے لیکن قدرت نے اس امت محمدؐیہ کو منتخب کیا اور جو شرف اور منزلت اس نے پچھلی امتوں کے انبیاءؑ اور رسولوںؑ کو دیا تھا وہ قدر ومنزلت اس نے امت محمدؐیہ کے تمام بندوں کو دیکر ان کے اوپر روزہ ہی نہیں واجب کیا بلکہ انہیں پچھلی امتوں کے انبیاءؑ اور رسولوںؑ کی صف میں بھی لاکر کھڑا کر دیا ہے۔ اب اسی روایت سے رمضان المبارک کی فضیلت اور روزہ داروں کے شرف کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ روزہ داروں کے اس عمل سے خوش ہوکر اللہ حدیث قدسی میں اعلان کر رہا ہے کہ روزہ میرے لیئے ہے اور میں ہی اس کی جزا دوں گا۔ جب کہ ساری عبادتوں کی جزا بھی اس کی طرف سے ملتی ہے لیکن روزہ اللہ کے نزدیک کچھ اور ہی فضیلت کا حامل ہے اور اس کے ذریعہ سے انسان اللہ کے مقرب بندوں میں شامل ہوجاتا ہے۔

مولانا موصوف نے کہا کہ انسان کو روزہ کی حالت میں گناہ کرنا تو دور، دل میں تصور تک بھی نہ لانا چاہیئے کیونکہ اسے یہ سمجھنا چاہیئے کہ اللہ نے اسے روزہ دار بنا کر کیا مرتبہ دیا ہے۔ لہٰذا رمضان المبارک کے مہینہ میں انسان کو کوئی ادنیٰ سا ادنیٰ گناہ بھی نہیں کرنا چاہیئے بلکہ اس بابرکت مہینہ میں انسان کو چاہیئے کہ وہ اپنے سبھی گناہوں کو معاف کروا کر اپنے پروردگار اور معصومینؑ کے قریب ہوجائے۔

مولانا کلب جواد نے کہا کہ شیعہ عقائد کے مطابق قرآن مجید میں جہاں جہاں مومنین سے خطاب کیا گیا ہے اسسے مراد حضرت علیؑ سے محبت کرنے والے ہیں۔ کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ انسان تب تک مومن ہی نہیں ہوسکتا جب تک اس کے دل میں حضرت علیؑ واہل بیتؑ کی محبت نہ ہو۔ رسولؐ کی حدیث اس سلسلے میں پکار پکار کے کہہ رہی ہے کہ یا علیؑ تمہاری محبت ہی ایمان ہے اس لئے قرآن میں جہاں کہیں بھی مومنین سے خطاب کیا گیا ہے اس کا مطلب علیؑ اور اہلبیتؑ سے محبت کرنے والے ہیں اسی لئے جتنی عبادتیں ہیں وہ سب علی سے محبت کرنے والوں کے لئے ہیں۔ اس لیئے علیؑ سے محبت ہے تو ہمیں ان کے بتائے ہوئے راستہ پر چل کر ان کا اتباع کرنا ہوگا تبھی ہم مومن کہلانے کے لائق ہوسکیں گے۔ لیکن آج حالات یہ ہیں کہ علیؑ سے تو محبت کا دعویٰ ہے لیکن عمل کے میدان میں کچھ نہیں۔ یہ ٹھیک نہیں انسان کو حضرت علیؑ کی سیرت کی پیروی کرنی چاہیے اسی سے ہماری دنیا وآخرت دونوں سنور سکتی ہے۔

دین آگے زندگی پیچھے

حضرت حرؑ ہجرت کے علامتی کردار ------------- معین الشریعہ مولانا کلب جواد صاحب

شیعہ قائد مولانا کلب جواد صاحب نے جمعۃ الوداع کے موقع پر جم غفیر کو خطاب کرتے ہوئے رمضان المبارک اور جمعۃ الوداع کی فضیلت بتائی۔ اور موجود لوگوں کو عمل خیر کی دعوت دیتے ہوئے کہا کہ اب جب کہ رمضان کا بابرکت مہینہ ایک دو دنوں میں ختم ہونے کو ہے ایسے میں ہم سب لوگوں کو چاہیئے کہ ان بچے ہوئے دنوں میں اپنے رب کی بھرپور عبادت کر کے اپنے گناہوں کی معافی مانگ لیں کیونکہ معلوم نہیں کہ آیندہ سال ان رحمتوں کو حاصل کرنے کا موقع ہمیں ملے کہ نہ ملے۔

مولانا کلب جواد صاحب نے موجود لوگوں سے کہا کہ عبادت کرنے کے سلسلہ میں ہمیں یہ قطعی نہیں سوچنا چاہیئے کہ ابھی بہت عمر پڑی ہے۔ کیونکہ اسے آیندہ آنے والے ایک سکنڈ کا بھی علم نہیں ہے لہٰذا وہ شیطان کے بہکاوے میں نہ آکر اپنی سبھی عبادتوں کو وقت پر کرتا رہے۔ اور انسان کو اپنے گناہوں کی توبہ فوراً کرنی چاہیئے نہ کہ بعد میں کیونکہ کب کیا ہوجائے کچھ خبر نہیں اور چونکہ توبہ کے معنی پلٹنا ہے اس لیئے انسان گناہوں کے راستے سے پلٹ کر راہ راست پر آجائے یہی توبہ ہے۔

مولانا نے کہا کہ اللہ نے انسان کو خلق کرنے کے بعد جہاں قرآن میں بھرپور تعریف کی ہے وہیں انسان کی برائی بھی کی ہے جس کا مطلب صاف ہے کہ اگر انسان خدا کی دی ہوئی بے شمار صلاحیتوں کو اچھے راستے اور کاموں میں لگا دے تو جہاں وہ مسجود ملائکہ بن جاتا ہے وہیں اگر اپنی انہیں صلاحیتوں کو غلط کاموں اور

راستوں میں لگا دے تو وہ جانوروں سے بھی بدتر ہوجاتا ہے لہٰذا ہمیں یہ دیکھنا اور سوچنا ہوگا کہ کہیں ہم ہوس دنیا کے چکر اور لالچ میں دین سے بھٹک تو نہیں گئے ہیں کیوں کہ دنیا کی محبت کے چلتے جہاں انسان ضلالت و گمراہی میں گھر کر پست سے پست تر ہوجاتا ہے وہیں اللہ، محمد و آل محمد علیہم السلام سے محبت و فرمانبرداری کے چلتے انسان معراج کی بلندیوں تک پہنچتا چلا جاتا ہے۔

جناب مولانا نے دنیا و آخرت کی تقدیم و تاخیر پر روشنی ڈالتے ہوئے ہجرت کی نسبت عالمانہ اظہار خیال کیا۔ فرمایا کہ ہجرت واجب ہے مگر وہ محض ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقلی ہی کا نام نہیں ہے بلکہ جہاں خلاف دین امور ہوں وہاں سے ہٹ جانا بھی ہجرت میں داخل ہے جیسے کوئی ایسی دوکان ہے جہاں صحیح ناپ تول نہیں ہوتی یا واجبی دام نہیں لیئے جاتے وہاں سے ہٹ جانا بھی ہجرت ہے اسی طرح اگر کسی اسکول، کالج میں بچوں کے عقیدے اور عمل محفوظ نہیں رہتے تو وہاں سے بچوں کا ہٹالیا جانا بھی ہجرت کے حکم میں ہے اسی طرح سے ملازمت کا معاملہ ہے کہ اگر اس نوکری میں انسان کا عقیدہ اور عمل محفوظ نہیں رہتے تو اس کا چھوڑنا بھی واجب ہے کیونکہ دین کے آگے رہنے اور زندگی کے پیچھے رہنے کا مطلب ہی یہی ہے۔

جناب نے اپنے کلمات کی تائید میں جناب حرؑ کے واقعہ کو پیش کیا کہ یزیدی لشکر میں رہتے حرؑ کے پاس عیش و عشرت کے کون سے اسباب مہیا نہیں تھے لیکن دین نہ تھا لہٰذا دین کو آگے بڑھا کر زندگی کو پیچھے رکھنے کے لیئے امام کی طرف ہجرت کی جہاں ایمان کے سوا کچھ نہ تھا حد ہے کہ دو گھونٹ پانی بھی نہ تھا۔ جناب حرؑ کربلا میں ہجرت کے علامتی کردار ہیں، ہمیں آخرت و زندگی کا سبق ان سے حاصل کرنا چاہیئے۔

نماز کے بعد آصفی مسجد میں ایک جلسہ منعقد کر کے جمعۃ الوداع کو ''**یوم قدس**'' کے طور پر مناتے ہوئے جہاں اپنے قبلۂ اول کی بازیابی کے لیئے دعا کی گئی وہیں امریکہ و اسرائیل کے خلاف زوردار احتجاج کیا گیا۔ اس جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے مولانا کلب جواد صاحب نے کہا کہ امریکہ، اسرائیل اور ان کے حامی ممالک کا ظلم فلوجہ کے مسلمانوں پر بڑھتا چلا جارہا ہے جو کافی تشویشناک ہے۔ کیوں کہ یہ سبھی ممالک بے گناہ مسلمانوں کو نشانہ بنا کر مسلم ملکوں کے لوگوں کو کچلنے کی ہر ممکن کوشش کررہے ہیں جسے مسلمان برداشت نہیں کرے گا۔ جلسہ کو مولانا مراد رضا، مولانا محمد میاں عابدی، مولانا امیر حیدر و مولانا عازم حسین نے بھی خطاب کیا۔

بڑے امامباڑہ میں جلسۂ اتحاد اور عید ملن کا انعقاد

لکھنؤ ۱۷ نومبر: عید الفطر کے موقع پر تاریخی آصفی امامباڑہ کے وسیع سبزہ زار پر ''جلسۂ اتحاد اور عید ملن'' کا انعقاد ہوا۔ امام جمعہ مولانا کلب جواد صاحب کی جانب سے منعقد جلسہ میں مذہبی رہنماؤں کے علاوہ سماجی و سیاسی لوگوں نے شرکت کی۔ مقررین نے اس موقع پر جہاں لکھنؤ میں شیعہ سنی اتحاد ہونے کی بات کہی وہیں اقلیتوں اور اکثریت کے مابین اتحاد پر زور دیا۔

اس موقع پر ریاست کے گورنر ٹی۔ وی راجیشور نے جلسہ کے ذریعہ عوام کو عید کی مبارکباد پیش کی اور راجدھانی میں ہندو مسلم اتحاد اور ایک دوسرے کی خوشیوں میں شریک ہونے کا ذکر کرتے ہوئے اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر مولانا کلب صادق صاحب نے اس موقع پر عید کے چاند کے مسائل طے نہ ہونے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اس بار بھی عید کے چاند کے بارے میں تھوڑی گڑبڑ ہوگئی لیکن اس بارے میں وہ کوئی ایسی بات کہنا نہیں چاہتے جس سے کسی کے دل کو ٹھیس پہونچے۔ انہوں نے کہا کہ اس کے باوجود وہ یہ ضرور کہیں گے کہ جب تک مسلمان شریعت کے فریم میں رہتے ہوئے جدید دور کی سائنس اور ٹکنالوجی کی سہولت سے فائدہ نہیں اٹھائیں گے تب تک یہ سلسلہ بنا رہے گا۔ انہوں نے اس سلسلہ میں کچھ فتووں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ دور جدید کے لحاظ سے جب تک اپنی روش کو نہیں بدلیں گے تب تک اس طرح کے مسئلہ پیش آتے رہیں گے۔ ڈاکٹر کلب صادق صاحب نے مسلمانوں میں علمی ثقافت پیدا کرنے پر زور دیا۔ انہوں نے ضلع مجسٹریٹ ارادھنا شکلا جو اس موقع پر سامعین میں موجود تھیں درخواست کی ہے کہ وہ ہماری زمینوں میں سے جو شہر میں پڑی ہوئی ہیں اس میں سے ایک پلاٹ فراہم کرا دیں جس پر وہ لڑکیوں کا ایک مثالی کالج کھولنے کے خواہشمند ہیں جس کے لیئے انہوں نے فنڈ کی کمی نہ ہونے کی بات کہی۔ کانگریس کے سابق ریاستی صدر جگدمبیکا پال نے جلسۂ اتحاد اور عید ملن پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اب یہ بات تو طے ہے کہ لکھنؤ سے شیعہ سنی جھگڑے کا نام و نشان ختم ہوگیا وہیں اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اقلیتوں اور اکثریت میں بھی اتحاد قائم رہے۔ اس موقع پر ریاستی گورنر کے ہاتھوں کلب عابد ایوارڈ تقسیم کیئے گئے۔ ایوارڈ پانے والوں میں سینئر صحافی عشرت علی صدیقی صاحب، فاضل نبیل چودھری سبط محمد نقوی صاحب، ولی الحق انصاری صاحب اور جے۔ ایم۔ یو کے سپرنٹنڈنٹ گرمیت سنگھ شامل ہیں۔

جلسہ کے آخر میں مولانا کلب جواد صاحب نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ (بشکریہ روزنامہ صحافت)